اسلام، امن اور رواداری

اسلام مکمل مذہبی آزادی دیتا ہے

جہاد کا اسلامی تصور، جنگ و تشدّد نہیں

مسلمانوں کو دیگر اہلِ دنیا کے ساتھ امن میں رہنے کی تعلیم دی گئی ہے

مصنّف:

ڈاکٹر زاہد عزیز

احمدیہ انجمن لاہور پبلیکیشنز، (UK)

اسلام، امن اور رواداری

اسلام مکمل مذہبی آزادی دیتا ہے،
جہاد کا اسلامی تصور، جنگ و تشدّد نہیں،
مسلمانوں کو دیگر اہلِ دنیا کے ساتھ امن میں رہنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

مصنّف: ڈاکٹر زاہد عزیز

مترجم: فائزہ علی (ایم ایس ایڈ)
ترجمہ پر نظر ثانی: ڈاکٹر زاہد عزیز

احمدیہ انجمن لاہور پبلیکیشنز، (UK)

انگریزی ایڈیشن اول، 2007

انگریزی ایڈیشن دوم، 2017

اردو ترجمہ، 2018

ناشر: احمدیہ انجمن لاہور پبلیکیشنز، (UK)

Ahmadiyya Anjuman Lahore Publications, U.K.
15 Stanley Avenue, Wembley, U.K.

ویب سائٹ:

www.ahmadiyya.org
www.aaiil.org

ای میل: info@ahmadiyya.org

Copyright © 2018 Ahmadiyya Anjuman Lahore Foundation (U.K.)

ISBN: 978-1-906109-29-5

پیش لفظ

اس کتابچہ کا مقصد ان وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے غلط تصورات اور بے بنیاد اعتراضات کی تردید کرنا ہے جن کے مطابق اسلام تشدد پسند، وحشت اور عدم برداشت کا مذہب ہے جو اپنے ماننے والوں کو حکم دیتا ہے کہ اس کے منکرین خلاف مسلسل جنگی جہاد کریں۔ اسلام پر یہ غلط الزام بھی ہے کہ وہ مذہبی آزادی کے خلاف ہے، دین کو جبر سے پھیلاتا ہے اور اپنے پیراوں کو موت کی سزا کا ڈر دے کر اسلام کے دائرہ میں رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس قسم کا ایک اور اعتراض بھی اسلام کے خلاف کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی تعلیمات کے متعلق نکتہ چینی کو برداشت نہیں کرتا اور مسلمانوں کو اس بات کی اجازت بلکہ حکم دیتا ہے کہ جو شخص اسلام پر کوئی الزام لگائے اسے قتل کر دیں۔

اسلام کے متعلق ان غلط اور بے بنیاد اعتراضات اور تصورات کی وجہ سے مغرب میں اسلام کے خلاف سخت دشمنی اور نفرت کی فضاء بن چکی ہے اور وہاں کے بعض معترضین کے نزدیک اسلام تہذیب انسانی کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے جس کا مقابلہ وہ از حد ضروری سمجھتے ہیں۔ بد قسمتی سے مسلمانوں کے بعض طبقے اپنے ہی اعلانات اور حرکات سے اسلام کے متعلق مغرب کے اس غلط خطرے کے احساس کو تقویت پہنچا رہے ہیں۔ دیگر مسلمانوں کی عام طور پر اس طرف بہت کم توجہ ہے کہ اسلام اور بانی اسلام رسول اللہ ﷺ کے چہرہ سے ان بدنما الزامات کو دور کیا جائے۔

یہ کتابچہ اسلام کے خلاف ایسے تمام غلط اور بے بنیاد اعتراضات کی تردید کرتا ہے۔ اس میں تمام مواد اور دلائل سب سے پہلے قرآن مجید اور پھر احادیث کی مستند کتب سے رسول اکرم صلعم کے اعمال اور اقوال سے لیے گئے ہیں۔ ابواب 2، 4 اور 5 کی تصنیف میں مولانا محمد علی صاحب مرحوم کے انگریزی ترجمہ قرآن مجید مع تفسیر، اردو ترجمہ

قرآن مجید مع تفسیر بعنوان 'بیان القرآن'، اور آپکی انگریزی کتاب The Religion of Islam سے استفادہ حاصل کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے باب 9 میں ممتاز مسلمان اور غیر مسلم علماء کی آراء کو شامل کیا گیا ہے، جنہوں نے اسلام کے متعلق مغرب کے غلط تصورات کو رَدّ کرتے ہوئے قریباً اسی موقف اور انہی تشریحات کی تائید کی ہے جن کو ہم اس کتاب میں پیش کر چکے۔

یہ کتابچہ میں نے انگریزی میں لکھا تھا اور اس کا اوّل ایڈیشن 2007ء میں شائع ہوا۔ اسکا اردو ترجمہ محترمہ قابلِ قدر بہن مسز فائزہ علی نے بہت محنت سے کیا۔ کچھ عرصہ ہوا کہ میں نے انگریزی کتابچے کی مکمل نظرِ ثانی کی، جسکے بعد 2017ء میں انگریزی میں دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ تو اس کی روشنی میں مَیں نے خود اردو ترجمہ کی نظرِ ثانی کی ہے، اور اردو قارئین کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کے مطابق بھی کچھ ردوبدل کی ہے۔

اردو ترجمہ کے لئے ناشر کتاب نے یہ بھی ضروری سمجھا ہے کہ آیاتِ قرآن مجید کا عربی متن بھی انکے ترجمہ کے ساتھ درج ہو، تاکہ کتاب زیادہ مستند اور مفید ہو اور قارئین قرآن مجید کی اصل عبارت کا ملاحظہ کر سکیں۔ جن احباب نے عربی شامل کرنے کا انتظام کیا، اللہ تعالیٰ انہیں جزا دے، آمین۔

خاکسار

زاہد عزیز (ڈاکٹر)،

ناٹنگھم، انگلستان

نومبر 2018ء

(نوٹ: قرآنِ کریم کے حوالے دیتے ہوئے، سورت کے نام کے بعد پہلا نمبر اس سورت کا نمبر ہے اور اسکے بعد ':' ڈال کر آیت کا نمبر یا آیات کے نمبر درج ہیں۔ مثلاً الحُجرات، 13:49 سے مراد سورت 49 کی آیت 13 ہے۔)

فہرست مضامین

پیش لفظ..... 1

1- رسول اکرم صلعم کی زندگی: دنیا کے لئے دوستی اور امن کا پیغام ہے ... 7

2 -اسلام میں مذہبی آزادی 17

دین میں جبر نہیں..... 17

عیسائیوں نے مسجد نبویؐ میں عبادت کی 23

قرآن مجید کی رُو سے تبلیغ کس طرح کرنی چاہیے 24

اسلام میں مُرتد کی کوئی سزا نہیں 30

جنگ کے دوران ارتداد 33

حدیث اور اسلامی فقہ کی کتب میں ارتداد 34

دوسرے مذاہب کے لوگوں کو تبلیغ کرنے کا حق..... 36

3- گالی گلوچ اور بے جا مذاق اڑانے کا جواب دینے
کے متعلق اسلامی تعلیمات 39

قرآن مجید گالی گلوچ کے جواب میں صبر کی تلقین کرتا ہے..... 40

گالی دینے والوں کی مجلس سے خاموشی اور وقار سے اٹھ جانا 44

رسولِ اکرم صلعم کی زندگی سے چند واقعات 45

4- جنگ کرنے کی اجازت کب ہے؟ 52

جنگ کرنے کی اجازت صرف اپنی دفاع کے لئے ہے 52

امن کو مقدم کیا جائے 57

دشمن کو پناہ دی جائے اگر وہ اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہے 58

بعد کی وحی میں رواداری کی تعلیم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی 59

غیر مسلمانوں سے دوستانہ تعلقات 65

5- جہاد کا صحیح مفہوم 76

اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے جہاد 77

جہاد صبر اور برداشت کے معنوں میں 78

اسلام کی تبلیغ کے لئے جہاد 79

جہاد بشکل جنگ 82

جنگ کے جہاد کی شرائط 85

6- شہادت 87

اسلام کے مطابق شہادت کیا ہے؟ 87

اسلام میں خودکشی گناہ ہے اور اپنی حفاظت کرنا فریضہ ہے 91

شہیدوں کو جنت میں حوروں کا بطور انعام ملنا 94

7- مسلمانوں کا غصّہ اور طیش 103

اسلام غصّہ پر قابو رکھنے کی تلقین کرتا ہے 103

انصاف کو نفرت پر سبقت ہے 105

حدیث میں غصّہ کے بارے میں ہدایات 107

8- جنگ بائیبل کی روشنی میں 109

بائیبل میں "جنگجو خُدا" 109

بائیبل میں جنگ کے متعلق قانون 110

بائیبل میں جنگ میں طریق کار کی مثالیں اور واقعات 111

حضرت عیسیٰؑ کے امن کے متعلق بیانات 114

سمسُون (Samson) کی کہانی 115

9- مسلمانوں کے غیر مسلمانوں سے تعلقات کی نوعیت 118

فلسفیانہ بنیاد 118

قانونی بنیاد 126

سیکولر (غیر مذہبی) یا غیر مسلم کی حکومت 128

اخلاقی بنیاد 130

10-جہاد کے بارے میں ممتاز علماء اور مفکرین کی آراء 133

1۔عبداللہ یوسف علی صاحب 133

2۔محمد مارماڈیوک پکھتال 135

3۔علامہ محمد اسد صاحب 137

4۔ٹی۔بی۔ارونگ صاحب 139

5۔مولوی چراغ علی صاحب 140

6۔ڈاکٹر سر محمد اقبال 142

7۔چیف جسٹس ایس۔اے۔رحمٰن صاحب 143

8۔ڈاکٹر جی۔ڈبلیو۔لائٹز 145

9۔سر ٹی۔ڈبلیو۔آرنلڈ 148

11-مسلمانوں میں عدم برداشت کیسے پیدا ہوئی؟

از خطبات مولانا محمد علی صاحب 154

1- رسول اکرم صلعم کی زندگی دنیا کے لئے دوستی اور امن کا پیغام ہے

محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور مثالی زندگی میں دنیا کے لئے دوستی اور امن کا پیغام ہے۔ اُن مسائل کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے جن پر اس کتاب میں بحث کی گئی ہے، یہ ضروری ہے کہ محمد رسول اللہؐ کی زندگی اور آپؐ کے مشن کے اہم پہلوئوں سے کچھ بنیادی واقفیت ہو۔

رسول اکرمؐ (571ء تا 632ء) جس قوم میں پیدا ہوئے ان کا کوئی مستقل مذہب نہ تھا۔ وہ مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے جو اپنے اپنے بُتوں اور دیگر چیزوں کی عبادت کرتے تھے، گو وہ ظاہری طور پر ان بُتوں سے عظیم تر ہستی اللہ کو بھی مانتے تھے۔ علم اور تعلیم سے خال خال لوگ واقف تھے۔ گو قبائلی رسم و رواج اور قواعد تو موجود تھے مگر انصاف، حقوق اور قانون کے کسی باقاعدہ نظام کا اس سرزمین پر نام ونشان نہ تھا۔ طاقتور کے لئے سب کچھ روا تھا۔ زندگی کے تمام شعبوں میں اخلاقی اقدار کی حالت کافی خراب تھی۔ کمزور، غلام اور عورتوں کے استحصال کا دور دورہ تھا۔ عرب کی سرزمین کے شمال کے ممالک میں جو تہذیب و تمدّن تھی اس کا یہاں کے لوگوں پر کوئی اثر نہ تھا۔ چند یہودی اور کچھ عیسائی قبیلے عرب میں رہ رہے تھے جن کو تہذیب و تمدن اور بلند اخلاق کا دعویٰ تو تھا مگر رسول اکرمؐ کی بعثت کے وقت ان کی اپنی حالت انتہائی گر چکی تھی اور ان میں عربوں کے اصلاح کرنے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔

رسول اکرمؐ مکّہ کے ممتاز قبیلہ قریش میں پیدا ہوئے۔ آپؐ کی چالیس سال تک کی زندگی میں زیادہ تر کوئی غیر معمولی واقعہ نہ ہوا اور آپؐ معمول کی زندگی گزارتے رہے۔ بہر حال اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس اثناء میں آپؐ کی شہرت ایک

نہایت ایماندار، باصول، پُر وقار اور قابل اعتماد اور کمزوروں کے حامی شخص کے طور پر پھیلی ہوئی تھی۔ آپؐ کو اپنے ارد گرد معاشرے کی زبوں حالی پر بیحد دُکھ تھا۔ چنانچہ آپؐ نے اپنا زیادہ تر وقت تنہائی میں روحانی بلندی حاصل کرنے کی غرض سے مراقبہ کرنے، روزے رکھنے اور دُعا کرنے میں مکّہ سے چند میل کے فاصلے پر ایک غار میں گزارنا شروع کیا۔ آپؐ نے ان مسائل میں گہرا غور و فکر شروع کیا کہ انسانی زندگی کا کیا مقصد ہے اور یہ کہ لوگوں کی اصلاح کس طرح کی جاسکتی ہے۔ اس ذہنی اور باطنی ریاضت کی بدولت آپؐ کو سچی خوابیں آنے لگیں جو آپؐ کی روحانی تقویت کا ذریعہ بنیں۔ اور پھر اچانک اللہ کی جانب سے آپؐ پر پہلی وحی نازل ہوئی اور اس سے آپؐ کا ذہن منور ہو گیا اور آپؐ کو نبوت کے منصب پر فائز کر دیا گیا۔ یہ واقعہ 609ء میں پیش آیا۔ آپؐ سے پیشتر دنیا کے عظیم مذاہب کے بانی، خاص طور پر حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت بدھؑ نے بھی ہدایت، شریعت، اور اللہ تعالیٰ کی بصیرت حاصل کرنے کے لئے ایسی ہی ذہنی، جسمانی اور باطنی ریاضت کی راہ اختیار کی تھی۔

رسول اکرمؐ پر 23 سال تک وحی کا نزول ہوتا رہا، جس کے ساتھ ساتھ آپؐ زندگی کے مختلف ادوار سے گزرتے رہے۔ آپؐ پر یہ حقیقت بطور وحی نازل ہوئی کہ اللہ کی ذات واحد ہے اور وہی ذات ہے جو ہمیشہ سے دنیا کی مختلف قوموں کی طرف رسول بھیجتی رہی ہے تاکہ وہ ان تک اس کی ہدایت پہنچاتے رہیں۔ اور اب اس نے رسول اکرمؐ کو بطور نبی اور رسول مبعوث کیا جس طرح دوسری قوموں کی طرف نبی مبعوث ہوتے رہے۔ آپؐ کی بعثت کی غرض بھی انہی بنیادی تعلیمات کا پیش کرنا تھا جن کی تبلیغ پہلے انبیاء نے کی تھی۔ لیکن آپؐ کی تعلیمات زیادہ وسیع، بین الاقوامی اور تمام انسانیت کے لئے تھیں۔ اسی لئے قرآن مجید کے شروع میں اللہ کی ذات کو رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ یعنی "تمام عالموں کے رَبّ" کے طور پر پیش کیا گیا ہے، اور اس کو محض ایک خاص قوم کے لئے مختص نہیں کیا

گیا۔ تمام عالم کے رَبّ ہونے کی حیثیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام قوموں کے لئے ہدایت نازل کی اور مسلمانوں کے لئے لازمی قرار دیا گیا کہ ایمان لائیں کہ اسی اللہ نے پہلی قوموں کی طرف رسول بھیجے اور کُتب نازل کیں۔ ہر ایک مسلمان کا ایمان ہے کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ، حضرت سلیمانؑ اور حضرت عیسیٰؑ، اللہ تعالیٰ کے اسی طرح سچے پیغامبر تھے جس طرح محمد رسول اکرمؐ اللہ تعالیٰ کے مقبول نبی و رسول تھے۔ جدید اسرائیلی ریاست کے متعلق مسلمانوں کے جو بھی جذبات ہوں لیکن اس کے باوجود وہ اس پاک ہستی یعنی حضرت یعقوبؑ کا برابر احترام اور عزت کرتے ہیں جن کے نام پر اس کا نام اسرائیل رکھا گیا۔ مسلمان اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کی سلطنتیں اللہ تعالیٰ نے اپنی تائید و نصرت سے قائم کی تھیں۔

دوسری طرح جو رسول اکرمؐ کی وحی نے آفاقی تعلیم دی وہ اس اعلان سے تھا: كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً (البقرة، 213:2)، یعنی ”تمام انسانیت ایک قوم ہے“۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام نسلیں، اقوام اور مذاہب برابر ہیں اور وہ ان سب سے یکساں انصاف کا سلوک کرتا ہے۔ قرآن مجید اس بارے میں واضح طور پر بیان کرتا ہے:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰكُمْ
(الحُجرات، 13:49)

”اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہاری شاخیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ تم میں اللہ کے نزدیک سب سے اکرم وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔“

کسی کی افضلیت کا معیار نسل، وراثت، رنگ، زبان یا کسی خاص مذہب سے منسلک

ہونا نہیں بلکہ دیانت داری اور فرائض کی انجام دہی ہے۔ نجات کا معیار اس بات پر بھی نہیں ہے کہ آپ کسی خاص قوم سے ہیں، یا آپ کن مذہبی عقائد رکھنے کے دعویٰ دار ہیں، یا آپ اپنے آپ پر کس مذہب کا نام چسپاں کرتے ہیں۔ قرآن مجید یہودیوں اور عیسائیوں کے اپنے اپنے ان دعووں کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ: وَ قَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی (البقرة، 111:2) یعنی "کوئی بھی جنت میں داخل نہیں ہو گا سوائے (یہودیوں کے مطابق) جو یہودی ہو, یا (عیسائیوں کے مطابق) جو عیسائی ہو"۔ اس کی تردید میں قرآن مجید انہیں بتاتا ہے کہ یہ انکی محض خواہشات ہیں، مگر ان کے بالمقابل قرآن یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ صرف مسلمان ہی جنت میں داخل ہوں گے، بلکہ اس طرح جواب دیتا ہے:

بَلٰی ۟ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ

(البقرة، 112:2)

"ہاں جس نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا فرماں بردار بنایا اور وہ احسان کرنے والا ہے تو اس کا اجر اس کے رَبّ کے پاس ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے آگے سر تسلیم خم کرے، اور دوسروں سے بھلائی کرے (جس کا دعویٰ یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کا اپنے اپنے متعلق ہے)، جس حد تک وہ کرے اسی کے مطابق اس کی نجات ہو گی۔ اصول سب کے لئے وہی ہے۔ یہ امر علیٰحدہ ہے کہ کونسے دین کی تعلیم اسکے ماننے والوں کو اس ضمن میں بلند ترین مقام پر پہنچا سکتی ہے۔

قرآن مجید ایک دوسری جگہ یہ فرماتا ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ

لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝ (المائدہ، 48:5)

"ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور طریق مقرر کیا اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک ہی گروہ (دینی امّت) بنا دیتا۔ لیکن (وہ چاہتا ہے) کہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہارے جوہر پرکھے۔ سو نیکیوں کو آگے بڑھ کر لو۔ تم سب کو اللہ کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے۔ پس جن باتوں میں تم اختلاف کرتے تھے وہ تمہیں بتا دے گا۔"

یعنی تمام مذاہب کے لوگوں کو اختلافات پر لڑنے کی بجائے نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

رسولِ اکرمؐ پر جو وحی نازل ہوئی اس نے یہ بھی تعلیم دی کہ ہر ایک بات کا فیصلہ سچ اور جھوٹ پرکھنے کے اصولوں پر ہونا چاہیے۔ نہ اس پر کہ اپنے ہم مذہب لوگوں کی طرفداری کی جائے اور دوسروں کے خلاف ناانصافی سے کام لیا جائے۔ اس بارے میں قرآن مجید مسلمانوں کو ذیل کے الفاظ میں نصیحت کرتا ہے:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۠ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدہ، 2:5)

"نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔"

اس لئے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نیکی کے کام کرنے چاہیے اور غلط اور بے انصافی کے کاموں میں ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دینا چاہیے۔ یہ آیت اس اعلیٰ

اصول کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ ہم اپنے ہم مذہب لوگوں کو غلط کام کرنے سے روکیں اور ان کی اصلاح کی کوشش کریں۔ مسلمانوں کو یہ بھی ہدایت کی گئی ہے کہ وہ سچے اور صادق لوگوں کا ساتھ دیں اور بد دیانت لوگوں کی پاسداری نہ کریں، قطع نظر کہ ان لوگوں کا مذہب کیا ہے۔ قرآن مجید کا فرمان ہے: وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (التوبة، 119:9)، یعنی "سچوں کے ساتھ ہو جاؤ"، اور وَ لَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا (النساء، 105:4)، یعنی "دغابازوں کی طرف سے جھگڑنے والا نہ بننا"۔

رسول اکرمؐ نے بعثت کی غرض کو پورا کرنے کے لئے تبلیغ کا آغاز مکّہ اور اس کے ارد گرد کے لوگوں سے کیا۔ چند لوگوں نے آپؐ کو قبول کیا۔ اسی وقت سے خود آپؐ کے قبیلے کے لوگوں نے مخالفت شروع کر دی۔ چنانچہ آپؐ اور آپؐ کے پیروؤں پر ظلم و ستم کا آغاز بھی اسی وقت سے ہو گیا تھا۔ اس ظلم و ستم میں دن بدن شدت آتی گئی۔ مسلمانوں کو نہ صرف جسمانی اذیتیں دی جانے لگیں بلکہ ان کا بہیمانہ قتل کیا جانے لگا۔ بعض جگہوں پر رسول اکرمؐ پر حملہ کیا گیا اور آپؐ پر پتھراؤ کیا گیا۔ مکّہ میں رسول اکرمؐ کے مشن کی صورتِ حال حضرت عیسیٰؑ کے مشن کی طرح تھی، یعنی آپؐ نے اپنی تبلیغ کا کام انتہائی ظلم و ستم کے حالات میں کیا۔ آپؐ کے کچھ صحابہ کو حبشہ، مشرقی افریقہ میں پناہ لینی پڑی۔

کچھ عرصہ بعد مدینہ کے لوگوں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا۔ یہ شہر مکہ کے شمال میں تقریباً 200 میل کے فاصلہ پر تھا۔ چنانچہ مکّہ کے مظلوم مسلمانوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کرنا شروع کی۔ رسول اکرمؐ اپنے دو نہایت قریبی ساتھی حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت علیؓ کے ساتھ مکّہ میں ٹھہرے رہے یہاں تک کے مکّہ کے تمام مسلمان جو جا سکتے تھے ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔ جب مخالفین نے رسول اکرمؐ کو آپؐ کے گھر میں ہی قتل کرنے کے منصوبے کو حتمی شکل دے دی، تب وہ خُدا کے حکم پر اپنے عزیز ترین ساتھی حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ مکہ سے چھپ کر نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور مکہ سے باہر

چند میل کے فاصلہ پر غارِ ثور میں پناہ لی، جب کہ آپؐ کے دشمن ان کا پیچھا کر رہے تھے۔ یہ اسلام پر سخت ترین اور انتہائی نازک وقت تھا۔ آپؐ کا پیچھا کرنے والے تلاش کرتے کرتے عین غار کے منہ پر پہنچ گئے، لیکن اس وجہ سے وہاں سے واپس چلے گئے کہ غار کے منہ پر مکڑی نے جال بن رکھا تھا جس سے انہوں نے یہ سمجھا کہ کوئی شخص اندر داخل نہیں ہوا ہو گا۔ رسول اکرمؐ کا اس طرح موت کے منہ سے بچ نکلنا ایک قسم کا دوبارہ زندہ ہونے کے مترادف تھا۔ اور آپؐ کی زندگی کا یہ واقعہ حضرت یونسؑ کے نشان کے مشابہ تھا جس کی پیشگوئی حضرت عیسیٰؑ نے اپنے متعلق کی تھی کہ "وہ زمین کے اندر تین دن تین رات رہے گا اور زندہ باہر آئے گا"۔ (متی، باب 12، آیات 39 تا 40)۔

مکہ میں 13 سال مشکل ترین حالات میں زندگی گزارنے کے بعد مدینہ میں 622ء میں رسول اکرم صلعم کی زندگی کا بالکل مختلف دور کا آغاز ہوا۔ اب آپؐ نہ صرف ایک منظم جماعت بلکہ ایک شہری حکومت کے سربراہ تھے۔ یہاں دس سال کے مختصر عرصہ میں اسلامی تعلیم، ایمانیات اور عقائد سے بڑھ کر ایک ملّی صورت میں ظہور پذیر ہوئی جس کا تعلق دینی ارکان مثلاً نماز اور روزہ کے علاوہ دیگر تمام زندگی کے دنیاوی معاملات، مثلاً معاشرتی قوانین، جنگ اور امن اور ریاست کے نظام سے تھا۔ حضرت موسیٰؑ کی طرح رسول اکرم صلعم بھی ایک نئی شریعت لانے والے ہو گئے۔

اسی دور میں مسلمانوں کو پہلی مرتبہ اپنے دفاع کے لئے تلوار اُٹھانی پڑی۔ مکہ سے ان کے دشمن جو رسول اکرم صلعم کے قبیلہ کے لوگ تھے، انھوں نے مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے فوج تیار کی۔ اس وقت رسول اکرم صلعم پر لڑائی کرنے کی اجازت کے لئے وحی نازل ہوئی۔ لیکن وہ بھی صرف اپنی دفاع کے لئے ان لوگوں کے خلاف جنھوں نے ان پر حملہ کیا یا کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اور یہ بھی مذہبی آزادی کو قائم کرنے کے لئے لڑائی کی اجازت دی گئی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی وحی یہ نازل ہوئی:

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ﴿۳۹﴾ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ (الحج، 22: 39 تا 40)

”ان لوگوں کو (جنگ کی) اجازت دی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ ان پر ظلم کیا گیا۔ اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ وہ جو اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے صرف اس بات پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا ربّ اللہ ہے۔ اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ نہ ہٹاتا رہتا تو یقیناً راہبوں کی کوٹھریاں اور گرجے اور یہودیوں کی عبادت گاہیں اور مساجد جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے، گرادی جاتیں۔“

پس مسلمانوں کو اس لئے جنگ لڑنے کی اجازت دی گئی ہے کہ ہر ایک مذہب کے ماننے والے، بلا روک ٹوک اور آزادی سے، اپنے مذہب پر عمل پیرا ہو سکیں اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ تمام مذاہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت کریں۔

تینوں بڑی جنگیں جو مسلمانوں نے لڑیں، یعنی بدر، احد اور خندق، یہ تمام مدینہ کے قریب لڑی گئیں اور آخری جنگ میں مدینہ کا محاصرہ کیا گیا۔ ہر دفعہ مسلمان دشمنوں کے مقابلہ میں کافی کم تعداد میں تھے۔ ان تاریخی حقائق سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمان اپنی دفاع کے لئے جنگ لڑ رہے تھے۔ لیکن ہر دفعہ دشمن کو شکست ہوئی اور آخر کار انھوں نے حملے کرنے چھوڑ دیے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح رسول اکرمؐ ذاتی طور پر جنگ میں شریک ہوتے۔ پھر ایک موقع پر صلح حدیبیہ ہوئی اور اس کے بعد امن کے زمانہ میں اسلام عرب میں تیزی سے پھیلا۔ دو سال کے بعد جب اہل مکہ نے صلح کے معاہدہ کی

خلاف ورزی کی، تو رسول اکرمؐ نے مکہ پر حملہ کر دیا اور دشمن کو ہتھیار ڈالنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا۔ آپؐ نے مکہ کو، جہاں سے آپؐ کو نکالا گیا تھا، بالآخر آٹھ سال کے بعد ایک قطرہ خون کا بہائے بغیر فتح کر لیا۔

جب آپؐ بطور فاتح مکہ میں داخل ہوئے تو آپؐ نے شہر کے چیدہ لوگوں کو مخاطب کیا جو ان کے سخت دشمن رہے تھے اور جنھوں نے آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو سخت اذیت دی تھی اور ان پر حد درجہ ظلم روا رکھا تھا۔ آپؐ نے ان سے پوچھا:

"تم مجھ سے کس قسم کے سلوک کی توقع رکھتے ہو؟"

یہ جانتے ہوئے کہ آپؐ انتقام نہ لینے والے تھے بلکہ لوگوں کو معاف کرنے والے تھے، انھوں نے جواب میں کہا:

"آپ ایک نیک سیرت بھائی ہیں اور ایک نیک سیرت بھائی کے بیٹے ہیں۔"

تب آپؐ نے اعلان کیا:

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ: "آج تم سب لوگوں پر کوئی ملامت نہیں"

(یہ وہی الفاظ ہیں جن میں قرآنِ کریم کے مطابق حضرت یوسفؑ نے اپنے گناہگار بھائیوں کو معاف کیا تھا، سورۃ یوسف، 92:12) یعنی آپ لوگوں پر کوئی الزام نہ لگایا جائے گا، کوئی عدالت نہ لگائی جائے گی جس کے نتیجہ میں کوئی سزا دی جائے۔ انکو آپؐ نے آزادی دی کہ اسلام قبول کریں یا نہ کریں۔

رسول اکرمؐ کی تعلیمات نے لوگوں کو اخلاقی، روحانی اور ذہنی و علمی طور پر بہت بلند کر دیا اور تہذیب و تمدّن کے لحاظ سے وہ اپنے زمانے کی تمام قوموں سے بہت آگے نکل گئے۔ یہی وجہ تھی کہ آپؐ کی وفات کے بعد ایک صدی کے اندر اسلام اُس زمانہ کی معلوم دنیا کے بڑے حصّہ میں پھیل گیا اور انھوں نے ایک عظیم تہذیب قائم کی جس میں علوم

اور روشن خیالی نے مثالی ترقی حاصل کی۔ یہ تہذیب ایک ہزار سال تک عروج پر رہی یہاں تک کہ موجودہ مغربی تہذیب کی ابتداء ہوئی۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ رسول اکرمؐ کے تاریخی کردار اور رہنمائی کو یوں بیان کرتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیآء، 107:21)

"اور ہم نے تجھے تمام قوموں کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔"

رسول اکرمؐ اور ان کی تعلیمات کے لئے مقدر ہے کہ وہ دنیا میں تمام اقوام، نسلوں، لوگوں اور مذاہب کے لئے رحمت ثابت ہوں۔

2 - اسلام میں مذہبی آزادی

اس باب میں یہ دکھانا مقصود ہے کہ اسلام میں ہر شخص کے لئے مذہب کی مکمل آزادی ہے کہ جس مذہب کو وہ چاہے اسے اختیار کرے، اور اس اصول کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اسلام کسی ایسے شخص کے لئے جو دین اسلام چھوڑ کر کوئی اور دین اختیار کرتا ہے کسی قسم کی سزا مقرر نہیں کرتا۔

دین میں جبر نہیں

قرآن مجید دین کے اختیار کرنے میں کسی قسم کے جبر کو قطعاً روا نہیں رکھتا۔ یہ حقیقت واضح الفاظ میں ذیل میں درج ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرة، 256:2)

"دین میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت کی راہ گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔"

درحقیقت قرآن مجید ایسے بیانات سے بھرا پڑا ہے جن میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ ایک یا دوسرے مذہب پر ایمان رکھنا ایک شخص کا اپنا ذاتی فعل ہے اور اس کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ ایک طریق اختیار کرے یا دوسرا۔ اگر وہ سچائی کو قبول کرتا ہے تو وہ اس کے اپنے بھلے کے لئے ہے۔ لیکن اگر وہ غلطی پر مصر رہتا ہے تو اس میں اسی کا نقصان ہے۔ اس بارے میں چند آیات کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

1- وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۟ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الكهف، 29:18)

"کہہ، حق تمہارے رَبّ کی طرف سے ہے۔ سو جو کوئی چاہے ایمان لائے اور جو کوئی چاہے انکار کرے۔"

2- اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (الدھر، 3:76)

"ہم نے اسے راستہ دکھادیا ہے، چاہے وہ شکر گزار ہے اور چاہے ناشکرا۔"

3- قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ؕ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ (الانعام،104:6)

"تمہارے پاس تمہارے رَبّ کی طرف سے روشن دلیلیں آچکی ہیں۔ سو جو کوئی دیکھتا ہے تو وہ اپنی جان کی بھلائی کے لئے ہے اور جو کوئی اندھا رہا اسی پر وبال ہے اور میں تم پر نگہبان نہیں۔"

4- اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۖ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (بنی اسرائیل، 7:17)

"اگر تم نے نیکی کی تو اپنا ہی بھلا کیا۔ اور اگر تم نے برائی کی تو اپنے لئے۔"

رسول اللہ صلعم اور ان کے ماننے والے ہر مسلمان کا فرض صرف یہ ہے کہ وہ سچائی کے پیغام کو لوگوں تک پہنچائے اور بس۔ اس بات کی وضاحت ذیل کی آیات میں کی گئی ہے:

1- فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ (اٰلِ عمران، 20:3)

"پھر اگر وہ اسلام قبول کریں تو یقیناً وہ ہدایت پر ہونگے، اور اگر وہ پھر جائیں تو تیرے ذمہ اس (پیغام) کا پہنچانا ہی ہے۔"

2- وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (التغابن، 12:64۔ نیز المائدہ، 92:5)

"اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ پھر اگر تم پھر جاؤ تو

ہمارے رسول کے ذمہ صرف (پیغام کو) کھول کر پہنچا دینا ہے۔"

3- قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (النور، 54:24)

"کہہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ پھر اگر وہ پھر جائیں تو اس (رسولؐ) پر صرف وہ (پیغام پہنچانے کا فرض) ہے جو اس کے ذمہ ڈالا گیا۔ اور تم پر وہ (ماننے کا فرض) ہے جو تمہارے ذمہ ڈالا گیا۔ اور اگر تم اس کی اطاعت کرو گے تو سیدھے رستے پر رہو گے اور رسول کے ذمہ سوائے کھول کر پہنچا دینے کے کچھ نہیں۔"

4- قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاۗءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ (یونس، 108:10)

"کہہ اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رَبّ کی طرف سے حق آ چکا۔ سو جو کوئی سیدھی راہ پر چلتا ہے وہ اپنے بھلے کے لئے ہی سیدھی راہ پر چلتا ہے اور جو کوئی گمراہ ہوتا ہے تو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے اور میں تم پر مختار نہیں۔"

5- اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (الزمر، 41:39)

"ہم نے تجھ پر لوگوں (کی بھلائی) کے لئے حق کے ساتھ کتاب اُتاری ہے سو جو کوئی سیدھی راہ پر چلتا ہے تو وہ اپنے بھلے کے لئے ہے اور جو کوئی گمراہ ہوتا

ہے تو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے اور تو اُن پر مختار نہیں۔"

6- وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ
(الانعام، 107:6۔ نیز دیکھیں الشوریٰ، 48:42)

"اور ہم نے تجھ کو ان پر نگہبان مقرر نہیں کیا اور تو اُن پر مختار نہیں"

7- فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (الرعد، 40:13)

"(اے رسول) تیرے ذمہ اس (پیغام) کا پہنچانا ہی ہے اور ہمارے ذمہ حساب لینا ہے۔"

8- وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ۭ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ
(الانعام، 66:6)

"اور تیری قوم نے اس (پیغام) کو جھٹلا دیا حالانکہ وہ حق ہے۔ کہہ: میں تم پر مختار نہیں۔"

9- وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (الانعام، 69:6)

"اور وہ لوگ جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، اُن پر کچھ حساب کا بوجھ نہیں اِن (نہ ماننے والوں) کے متعلق۔ لیکن (ان لوگوں کا کام) نصیحت کرنا ہے کہ شاید وہ (یعنی نہ ماننے والے) تقویٰ کریں۔"

10- وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ۣ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ
(قٓ، 45:50)

"اور تو (اے رسول) ان پر جبر کرنے والا نہیں۔ سو قرآن کے ساتھ اسے

نصیحت کر جو میرے وعدہِ عذاب سے ڈرتا ہے۔"

قرآن مجید اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ دنیا میں کچھ لوگ ایمان لاتے ہیں اور کچھ نہیں لاتے۔ اور یہ تعلیم دیتا ہے کہ کوئی انسان اس معاملہ میں دوسروں پر جبر کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ رسول اکرم صلعم کو قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (یونس، 99:10)

"اور اگر تیرا ربّ چاہتا تو زمین میں جس قدر لوگ ہیں سب کے سب ایمان لے آتے۔ تو کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا یہاں تک کہ وہ مومن بن جائیں۔"

اس آیت کا اشارہ رسولِ اکرمؐ کے دردِ دل کی طرف ہے کہ لوگ کیوں نہیں اپنی ہی بھلائی کی خاطر آپؐ کی لائی ہوئی ہدایت کو قبول کرتے۔ آپکے اس درد کا ذکر قرآن مجید میں دو جگہ صاف طور پر آتا ہے:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا (الکھف، 6:18)

"تو کیا تُو اپنی جان کو انکے پیچھے غم سے ہلاک کر دے گا اگر وہ اس بات (یعنی اسلام کی سچائی) پر ایمان نہ لائیں۔"

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (الشعرآء، 3:26)

"کیا تُو اپنی جان کو ہلاک کر دے گا کہ یہ ایمان نہیں لاتے۔"

جو شخص اپنے پیغام کے منکرین پر اس حد تک غم اور رنج میں مبتلا ہو کہ انکے لئے دعا کر کے اپنے آپ کو ہلاک تک کر رہا ہو، کیا وہ سوچ بھی سکتا ہے کہ وہ ان پر ظلم کر کے ان سے جبراً اپنے آپ کو منوائے؟

مسلمانوں کے لئے قرآن مجید میں یہ بھی تعلیم ہے کہ وہ اولاً تو اپنی اصلاح کریں، کیونکہ گمراہ لوگ جو حق کے منکر ہیں وہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (المائدہ، 105:5)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے نفسوں کی فکر کرو۔ جو گمراہ ہوا وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا جب تم ہدایت پر ہو۔ تم سب نے اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے، سو وہ تم کو اس کی خبر دے گا جو (اعمال) تم کرتے تھے۔"

اس ارشاد کے پیشِ نظر مؤمنین کا غیر مسلمانوں پر جبر کر کے انہیں راہِ راست پر لانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

پھر تمام قوموں کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ (المائدہ، 48:5)

"ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور طریق مقرر کیا اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک ہی گروہ (دینی امّت) بنا دیتا۔ لیکن (وہ چاہتا ہے) کہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہارے جوہر دیکھے۔ سو نیکیوں کو آگے بڑھ کر لو۔ تم سب کو اللہ کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے۔ پس جن باتوں میں تم اختلاف کرتے تھے وہ تمہیں بتا دے گا۔"

عیسائیوں نے مسجد نبویؐ میں عبادت کی

رسول اکرم صلعم کی وفات سے تقریباً ایک سال قبل ایک مشہور واقعہ ہوا جو اس بات کی ایک نہایت نمایاں مثال ہے کہ آپؐ مذہب کے معاملے میں آزادی کے کس قدر زبردست حامی تھے۔ یمن کے قریب نجران سے ایک بڑا عیسائیوں کا وفد اپنے چند مقتدر عمائدین کی سرکردگی میں مدینہ آیا کہ رسول اکرم صلعم سے اسلام اور عیسائی عقائد کے اختلاف کے بارے میں گفتگو کرے، بطور خاص اس مسئلہ پر کہ آیا حضرت مسیح ایک بشر تھے یا خدا۔ وفد کی آمد پر رسول اکرم صلعم نے ان کو مسجد نبویؐ سے ملحقہ کمروں میں ٹھہرایا۔ بحث سے پیشتر عیسائیوں کی عبادت کا وقت ہو گیا۔ تو انھوں نے رسول اکرم صلعم سے پوچھا کہ وہ کہاں اپنی عبادت کر سکتے ہیں۔ رسول اکرم صلعم نے مسجد کے اندر ہی عبادت بجالانے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ انھوں نے مسجد کے اندر ہی اپنی عبادت اپنے طریق پر ادا کی جو اسلام سے مختلف تھی۔ یہ مسجد جیسا کہ سب کو علم ہے مسلمانوں کے لئے ایک انتہائی مقدّس اور قابلِ احترام عبادت گاہ ہے۔ عیسائیوں کے وفد نے رسول اکرم صلعم سے جو بحث مباحثہ کیا اس کی تفصیل کئی اسلامی تاریخ اور سیرت کی کتابوں، اور قرآن مجید کی تفسیروں میں درج ہے۔ سیرت ابن اسحاق میں ہے:

> ”جب وہ مدینہ پہنچے تو وہ مسجدِ نبوی آئے جب کہ رسول اللہؐ عصر کی نماز پڑھ رہے تھے۔ . . . جب انکی عبادت کا وقت آیا تو انہوں نے کھڑے ہو کر مسجدِ نبوی میں اپنی نمازیں پڑھنی شروع کیں، اور آپؐ نے فرمایا کہ انہیں پڑھنے دو۔ انہوں نے مشرق کے رخ نماز پڑھی۔“
>
> (سیرت ابن اسحاق کا انگریزی ترجمہ، The Life of Muhammad، مترجم Alfred Guillaume، آکسفورڈ، 1955، صفحہ 271)

قرآن مجید کی رُو سے تبلیغ کس طرح کرنی چاہیے

1۔ قرآن مجید سے ایک آیت جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو دوسرے لوگوں کو دعوت اسلام کس طرح کرنی چاہیے، ذیل میں درج کی جاتی ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ (النحل، 125:16)

"اپنے رَبّ کے رستے کی طرف حکمت اور اچھے وعظ سے بلا اور اُن کے ساتھ اس طریق پر بحث کر جو نہایت عمدہ ہو۔ تیرا رَبّ اسے خوب جانتا ہے جو اس کے رستے سے گمراہ ہوا اور وہ سیدھی راہ پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے۔"

آیت مذکورہ میں لفظ "حکمت" کا مطلب ہے کہ عقل اور علم سے لوگوں کو بات سمجھائی جائے، انکی جہالت کو دور کیا جائے، نہ کہ انکو ان کے تعصب یا جہالت کے مطابق کی غلط تعلیم دے کر ان میں مقبولیت حاصل کی جائے۔ "عمدہ طریق" کا مطلب ہے کہ بہترین دلائل اور شواہد نہایت شائستگی، نرم روی اور احسن طریق پر پیش کیے جائیں اور دوسروں کے جذبات کو بھی مجروح نہ کیا جائے۔

2۔ ایک اور جگہ قرآن مجید میں ہے:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ﴿۳۴﴾ وَمَا یُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا یُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ﴿۳۵﴾ (حٰمٓ السجدہ، 33:41 تا 35)

"اور اس سے بہتر کس کی بات ہے جو اللہ کی طرف بلاتا ہے اور اچھے کام کرتا ہے اور کہتا ہے میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ نیکی اور بدی برابر نہیں۔ (بدی کو) بہت اچھے طریق سے دور کر۔ پھر تو دیکھے گا کہ وہ شخص کہ تجھ میں اور اس میں دشمنی ہے گویا وہ دل سوز دوست ہے۔ اور یہ خصلت انہی کو دی جاتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ انہی کو دی جاتی ہے جو بڑے نصیب والے ہیں۔"

دعوتِ اسلام کے طریق جو اوپر کی آیات میں بتائے گئے ہیں، وہ یہ ہیں:

- تقریر یا گفتگو کے ذریعہ، نہ کہ جبر و تشدد سے۔
- خود نیک اعمال کا نمونہ دکھانے کے ذریعہ، نا کہ محض زبانی تبلیغ کے ذریعے۔
- مخالف کے برے عمل کے مقابلے میں نیک سلوک۔ پھر ہی مخالف کا دل جیتا جائے گا اور وہ دل سوز دوست بن جائے گا۔
- مندرجہ بالا طریقوں کے استعمال میں انتہائی صبر دکھانا، وہ واحد موثر راہ ہے جس کے ذریعہ یہ طریق کامیاب ہوسکتے ہیں۔

3۔ قرآن مجید میں مسلمانوں کو تعلیم دی گئی ہے کہ دعوتِ اسلام دیتے ہوئے دوسروں سے لڑنے کی بجائے، مشترک امور کو پیش کرو:

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿٤٦﴾

(العنکبوت، 46:29)

"اور اہلِ کتاب سے جھگڑا (یعنی بحث و مباحثہ) نہ کرو مگر ایسے طریق سے جو نہایت اچھا ہو۔ سوائے (ان کے ساتھ) جو اُن میں سے ظالم ہیں۔ اور کہو ہم

اس پر ایمان لائے جو ہماری طرف اُتارا گیا اور تمہاری طرف اُتارا گیا اور ہمارا معبود اور تمہارا معبود ایک ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔"

یہاں "ظالم" سے مراد وہ لوگ ہیں جو ہٹ دھرمی اور تعصب سے کوئی معقول دلیل قبول کرنے کو تیار نہیں، اور جو دانستا جھوٹ اور چالاکی کا استعمال کرتے ہیں۔ ان سے بحث و مباحثہ کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس آیت میں مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ بحث و مباحثہ میں شروع میں ہی وہ امور پیش کریں جو ان میں اور دوسروں میں مشترک ہیں، کہ ہم آپ کے الٰہی صحیفوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں، کیونکہ جس اللہ نے قرآن نازل کیا وہ وہی ہستی ہے جس نے آپ کی مقدس کتابوں کو نازل کیا۔

4۔ دوسرے مذاہب کے لوگوں کو اسلام پیش کرنے سے مسلمانوں اور ان میں کوئی جھگڑا نہیں ہو گا اگر مسلمان انصاف پر قائم رہیں:

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۭ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۭ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿١٥﴾

(الشوریٰ، 15:42)

"سو تُو اسی کی طرف بلا۔ اور سیدھی راہ پر چلتا رہ جیسا تجھے حکم دیا گیا ہے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر اور کہہ کہ میں اس پر ایمان لایا جو اللہ نے کتاب اُتاری ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان انصاف کروں۔ اللہ ہمارا رَبّ اور تمہارا رَبّ ہے۔ ہمارے لئے ہمارے عمل ہیں اور تمہارے لئے تمہارے عمل۔ ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں۔ اللہ ہمیں جمع کرے گا اور اسی کی طرف انجام کار پھر کر آنا ہے۔"

"خواہشوں کی پیروی" کرنے اور لوگوں کے درمیان نہ انصاف کرنے کی مثالوں میں یہ شامل ہے کہ سمجھنا کہ اللہ ہماری طرفداری کرے گا خواہ ہم جو مرضی کریں، اور ہمارے تو بڑے سے بڑے گناہ اللہ معاف کرے گا مگر دوسرے مذاہب والوں کو ان کے چھوٹے سے چھوٹے گناہوں کی سزا دیگا، ہمیں تو اللہ ہمارے نیک اعمال کی جزا دے گا مگر دوسروں کو انکے نیک اعمال کا کوئی اجر نہیں دے گا۔ اس آیت میں مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ غیر مذاہب کے لوگوں کو کہیں کہ اللہ جس طرح ہمارا رب ہے اسی طرح وہ تمہارا رب بھی ہے۔ وہ اعمال کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیے کہ ایک دوسرے سے جھگڑا کرنے کی بجائے، اپنے اعمال کو دوسروں کے اعمال سے بہتر بنانے کی کوشش کریں۔

5۔ قرآن مجید مسلمانوں کو دوسرے مذاہب کے معبودوں کو برا بھلا کہنے سے بھی منع کرتا ہے۔ اس کا فرمانا ہے:

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ۭ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿١٠٧﴾ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ (الانعام، 6:107 تا 108)

"اور اللہ اگر چاہتا تو وہ شرک نہ کرتے اور ہم نے تجھ کو اُن پر نگہبان مقرر نہیں کیا اور تو اُن پر مختار نہیں۔ اور اُن (معبودوں) کو گالی نہ دو جن کو یہ اللہ کے سوائے پکارتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ زیادتی کر کے بے علمی سے اللہ کو گالی دیں۔"

6۔ اسی تعلق میں ذیل کی آیات میں بھی قابلِ توجہ ہیں:

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ۭ وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿١٩٨﴾ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿١٩٩﴾ (الاعراف، 7:198 تا 199)

"اور اگر تم انہیں ہدایت کی طرف بلاؤ تو وہ سنتے نہیں۔ اور تُو انہیں دیکھتا ہے تیری طرف دیکھتے ہیں، مگر انہیں دکھائی نہیں دیتا۔ درگزر کو ہاتھ میں لے، اور نیک کام کا حکم دے، اور جاہلوں سے کنارہ کر۔"

یہاں ہمیں تعلیم دی گئی ہے کہ جب ہم پیغامِ اسلام ایسے لوگوں کو پہنچائیں جو تعصب سے اندھے اور جہالت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اس پیغام کو سمجھنے سے قاصر ہوں، تو ہمیں ناراض ہو کر غصّہ میں آنے کی بجائے یا انکے خلاف تشدد کرنے کی بجائے، انہیں معاف کر دینا چاہیے، اور انکی توجہ سیدھے سادھے اچھائی کے کاموں کی طرف دلوائیں، وہ باتیں جو وہ سمجھ سکیں، اور پھر ان سے کنارہ کشی کر کے تو معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں۔ مزید قرآن کریم ہمیں یہ بھی صاف تعلیم دیتا ہے کہ ہم جاہلوں سے نہ اُلجھیں، بلکہ انہیں سلام کرتے ہوئے ان سے کنارہ کشی کریں:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿٦٣﴾ (الفرقان، 63:25)

"اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر انکساری سے چلتے ہیں اور جب جاہل انہیں مخاطب کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں: سلام۔"

وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۖ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۖ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ﴿٥٥﴾

(القصص، 55:28)

"اور جب وہ (یعنی مؤمنین) لغو بات سنتے ہیں، اس سے کنارا کرتے ہیں، اور کہتے ہیں: ہمارے لئے ہمارے عمل ہیں اور تمہارے لئے تمہارے عمل ہیں۔ تم پر سلام ہو، ہم جاہلوں کو نہیں چاہتے۔"

7۔ رسول اللہؐ کی زندگی کے ایک واقعے سے مثال ملتی ہے کہ اسلام کیسے آپؐ کے نمونے سے لوگوں نے قبول کیا۔ آپؐ پر ایک یہودی عالم کا قرض تھا، اور وہ آپؐ سے مانگنے آیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ میرے پاس تمہیں دینے کو کچھ نہیں ہے۔ اس نے کہا: "یا محمد، میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا جب تک تُو میرا قرض نہ ادا کرے"۔ تو آپؐ نے فرمایا: "میں پھر تمہارے ساتھ ہی رہوں گا"۔ تو آپؐ وہیں بیٹھے رہے، اور باقی دن، بلکہ اگلے دن فجر تک، نمازیں بھی وہیں پڑھتے رہے۔ آپؐ کے صحابہؓ بہت تنگ آئے اور اس یہودی کو دھمکیاں دینے لگے کہ اسے نکال دیں گے۔ مگر آپؐ نے انہیں اجازت نہیں دی اور کہا:

مَنَعَنِیْ رَبِّیْ اَنْ اَظْلِمَ مُعَاهِداً وَ غَیْرَهٗ،

"میرے ربّ نے مجھے منع کیا ہے کہ میں کسی ذِمّی وغیرہ پر ظلم کروں۔"

ذِمّی وہ اہلِ کتاب تھے جو مسلمانوں کے زیرِ حکومت رہتے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ جب دن چڑھا تو اس یہودی نے کلمۂ شہادت پڑھا اور اپنا آدھا مال اللہ کی راہ میں پیش کیا۔ اس نے کہا کہ میں نے جو آپ کے ساتھ کیا وہ یہ دیکھنے کے لئے کیا کہ آیا توراۃ میں جو آپ کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں، وہ آپ میں موجود ہیں۔ اور جن خوبیوں کا اس یہودی نے ذکر کیا ان میں یہ بھی تھیں کہ وہ نبی "نہ بدزبان سنگدل ہو گا، نہ بازار میں شور مچانے والا، نہ فحش گوئی اس میں ہو گی، اور نہ بیہودہ بات کہنے والا ہو گا"۔ اس واقعہ سے ایک تو یہ ثابت ہوا کہ جو غیر مسلمان، مسلمانوں کے زیرِ حکومت رہتے ہوں، ان پر ظلم کرنے کی بجائے انکو منصفانہ طور پر انکے حقوق دینے چاہئیں، اور ان سے نیکی اور نرمی کا سلوک کرنا چاہیے۔ دوسرا یہ کہ محض اعلیٰ اخلاق اور مہذب طرزِ عمل کے نمونہ سے بھی اسلام پھیلا۔

اسلام میں مُرتد کی کوئی سزا نہیں

یہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اسلام کے مطابق دینِ اسلام کو چھوڑنے والے کے لئے موت کی سزا ہے۔ جو کوئی بھی قرآن مجید کا مطالعہ کرنے کی تکلیف گوارہ کرے گا، اس کو واضح طور پر نظر آئے گا کہ اس میں ایسے کسی حکم کا قطعاً کوئی ذکر نہیں، بلکہ اشارہ تک بھی نہیں۔

1۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ایسے لوگوں کا ذکر ملتا ہے جو ایمان لانے کے بعد کفر کی طرف لوٹ گئے۔ لیکن ایک دفعہ بھی ایسا ذکر نہیں ملتا کہ ایسے لوگوں کو مار دیا گیا یا ان کو کوئی سزا دی گئی۔ ایک جگہ پر قرآن مجید جنگ کا حوالہ دیتا ہے جہاں مخالفین مکہ نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا:

وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (البقرہ، 217:2)

''اور وہ تم سے ہمیشہ جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ تمہیں تمہارے دین سے لوٹا دیں اگر انھیں طاقت ہو۔ اور جو شخص تم میں سے اپنے دین سے پھرے، اور پھر مر جائے جب کہ وہ کافر ہی ہو۔ سو یہی ہیں جن کے عمل دنیا اور آخرت میں کام نہ آئے۔''

یہ آیت صاف طور پر ایک ایسے شخص کا ذکر کرتی ہے جو دینِ اسلام سے مُرتد ہونے کے بعد زندہ رہتا ہے اور پھر کُفر کی حالت میں اس کی وفات ہوتی ہے۔ اس آیت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ طاقت دشمنوں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف استعمال کی گئی کہ وہ

اسلام سے پھر جائیں، نہ کہ خود مسلمانوں نے اپنے اندر مسلمانوں کے خلاف استعمال کی کہ وہ اسلام سے نہ پھریں۔

2۔ قرآن مجید یہ بھی فرماتا ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ (المائدہ، 5:54)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ ایک قوم لائے گا جن سے وہ محبت رکھے گا اور وہ اُس سے محبت رکھیں گے۔"

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ (آلِ عمران، 3:90)

"جو اپنے ایمان کے بعد کافر ہوئے، پھر کفر میں بڑھتے گئے، ان کی توبہ قبول نہیں ہو گی اور وہی گمراہ ہیں۔"

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا (النساء، 4:137)

"بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے پھر کافر ہوئے۔ پھر ایمان لائے پھر کافر ہوئے۔ پھر کفر میں بڑھ گئے۔ تو اللہ یہ نہیں کہ ان کی مغفرت کرے اور نہ یہ کہ ان کو سیدھی راہ پر چلائے۔"

مندرجہ بالا آخری آیت کچھ ایسے لوگوں کا ذکر کرتی ہے جو کبھی اسلام قبول کرتے اور پھر کفر میں چلے جاتے۔ انھوں نے از خود اسلام قبول کیا اور پھر اس کو چھوڑ دیا اور کفر میں پکے

رہے۔ مسلمانوں کی طرف سے ان کو کوئی سزا نہ دی گئی، نہ ہی ایسی کوئی سزا مقرر ہے جو ان پر لاگو ہوتی ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ یوم حساب ان پر سزا مرتّب کرے گا۔

3۔ قرآن مجید مدینہ میں رہنے والے ایک یہودی گروہ کا ذکر کرتا ہے جنھوں نے پہلے اسلام قبول کیا اور پھر اس کو چھوڑ دیا۔ اور اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے لوگوں کو یہ تاثر دیا جائے کہ اسلام کوئی ایسا دین نہیں جس کو قبول کرکے انسان کو کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے یا یہ کوئی قابلِ قدر مذہب ہے۔

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (اٰلِ عمران، 72:3)

"اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کہا کہ دن کی ابتدا میں اس پر ایمان لے آؤ جو ان لوگوں پر اُتارا گیا ہے جو ایمان لائے ہیں اور اس کے آخر میں انکار کردو تاکہ وہ لوٹ آئیں۔"

یہ منصوبہ کہ پہلے اسلام قبول کرنے کا اعلان کریں اور اس کے کچھ دیر بعد اس کا انکار کردیں، اس کا ان کو کبھی خیال آ ہی نہ سکتا تھا جبکہ وہ مدینہ میں مسلمانوں کے تحت رہ رہے تھے، اگر قرآنی احکامات کی رُو سے اسلام چھوڑنے کی سزا موت ہوتی۔

4۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام Encyclopaedia of Islam، جس میں زیادہ تر غیر مسلم مغربی مستشرقین کے تحقیقی مضامین ہوتے ہیں، اس میں 'مُرتد' کے مضمون کے شروع میں ولی ہیفننگ Willi Heffening لکھتا ہے کہ:

"قرآن میں مُرتد کو صرف آخرت میں سزا سے ڈرایا گیا ہے۔"

(جلد 3، ص736، پرانا ایڈیشن۔ جلد 7، ص635، نیا ایڈیشن)

جنگ کے دوران ارتداد

مُرتد کی سزا موت کا غلط خیال معلوم ہوتا ہے یہ اس وجہ سے پیدا ہوا کہ وہ لوگ جو مُرتد ہونے کے بعد دشمن کے ساتھ جنگ میں شامل ہو گئے ان کو لازماً دشمن ہی تصور کیا گیا یا یہ کہ جہاں ایک مُرتد نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا ہو، ان دونوں صورتوں میں موت کی سزا دی گئی۔ لیکن یہ سزا ارتداد کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے جرم قتل کی سزا تھی۔

قرآن مجید مختلف قسم کے لوگوں کا ذکر کرتا ہے جنھوں نے جنگ کے دوران اسلام کو چھوڑا (دیکھیے سورۃ النساء، آیات 88 تا 91)، اور مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے۔ وہ لوگ جو کھلم کھلا دشمن کے ساتھ شامل ہو جائیں، جن کے ساتھ مسلمانوں کی جنگ تھی، تو ان کے ساتھ دشمنوں کی طرح جنگ کی جائے۔ چند دیگر قسم کے لوگوں کے متعلق قرآن مجید ذیل کی ہدایت دیتا ہے:

اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا (النساء، 90:4)

”مگر جو ایسی قوم سے جا ملیں کہ تم میں اور ان میں معاہدہ ہے۔ یا تمہارے پاس آئیں اس حال میں کہ ان کے سینے تنگ ہیں کہ تمہارے ساتھ جنگ کریں یا اپنی قوم کے ساتھ جنگ کریں۔ اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو تم پر قابو دے دیتا سو وہ تم سے ضرور لڑتے۔ پس اگر وہ تم سے کنارہ کش ہوں اور تم سے جنگ نہ

کریں اور تم سے صلح کی درخواست کریں تو اللہ نے تمہارے لئے ان کے خلاف کوئی راہ نہیں رکھی۔"

یعنی جنگ تک کی صورت میں بھی اگر کوئی مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے مگر ایسے غیر مسلمانوں سے جا ملتا ہے جن کے ساتھ مسلمانوں کا امن کا معاہدہ ہے، یا ایسا شخص جنگ میں بالکل حصّہ نہیں لیتا، تو مسلمان اس کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

حدیث اور اسلامی فقہ کی کتب میں ارتداد

یہ خیال کہ مُرتد کی سزا قتل ہے اس کی بنیاد اسلامی فقہ پر ہے۔ فقہاء نے بعض احادیث کی بناپر یہ رائے قائم کی ہے۔ یہ بات جائے غور ہے کہ فقہ کی کتب میں فیصلے انسانی غور و فکر کا نتیجہ ہیں، اس لئے ان میں خطا کا احتمال ہے۔

اگر احادیث کا احتیاط سے مطالعہ کیا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مُرتد کی سزا قتل نہیں جب تک بعض دوسرے حالات نہ شامل ہوں جن میں مجرم کو موت کی سزا دی جاسکتی ہے، جیسا کہ ایسے دشمنوں سے مل جانا جن سے مسلمانوں کی جنگ ہو رہی ہو۔ کوئی حدیث قرآن میں بیان کردہ اصولوں کو کسی صورت میں بھی ردّ نہیں کر سکتی۔ اس طرح کی حدیث، مثلاً کہ "جو کوئی مذہب تبدیل کرے اس کو قتل کر دو"، اس پر یہ شرط عائد کرنا لازم ہے کہ تبدیلی مذہب کے علاوہ اس شخص نے مسلمانوں کے خلاف کوئی ایسا جرم کیا ہو جس کی سزا ہر ایک ایسے مجرم کے لئے موت ہوتی ہے۔

فقہ کی کتب اس بات کو تسلیم کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں کہ محض دینِ اسلام چھوڑنا ایک قابل سزا جرم نہیں۔ لیکن اگر مُرتد مسلمانوں کے خلاف جنگ میں شریک ہوتا ہے ہے تو اس کو بلحاظ جنگی دشمن لڑائی کرنے والے کی طرح موت کا سامنا کرنا ہو گا۔ اسی بناپر فقہ کی مشہور کتاب 'الھدایہ' نے یہ اصول قائم کیا کہ ایک عورت مُرتد کو موت کی سزا

نہیں دی جاسکتی، کیونکہ عورت جنگ کرنے کے قابل نہیں۔ اس کتاب میں ذیل کے بیانات بھی درج ہیں: ''ارتداد میں قتل کرنا جنگ کے فتنہ کو ختم کرنے کے لئے ضروری ہے، نہ کہ یہ کفر اختیار کرنے کی سزا ہے'' اور ''محض کفر بذاتِ خود ایک شخص کو قتل کرنا جائز نہیں کر دیتا۔''

یہ فقہا کی غلطی ہے، جس میں انہوں نے قرآن مجید کے واضح احکامات کی خلاف ورزی کی ہے، کہ ایک مسلمان جو دین اسلام کو چھوڑتا ہے وہ لازمی طور پر ان دشمنوں سے جاملا ہے جو مسلمانوں سے برسرِ جنگ ہیں۔

اگر قرآن مجید اور رسولِ اکرم صلعم کی سنت کو اسلامی تعلیمات کے تعیّن کے لئے اعلیٰ ترین معیار گردانا جائے جو ایک حقیقت ہے، تو اس بات سے قطعاً انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسلام ہر شخص کو مکمل آزادی دیتا ہے کہ وہ کسی بھی مذہب کو اختیار کرے۔ اور مسلمانوں کو قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ اگر کوئی شخص اسلام کو چھوڑتا ہے تو اس کو کسی قسم کی سزا دیں۔

آخر میں ایک نہایت اہم بات کی وضاحت ضروری ہے، کہ ایک شخص اسلام کو صرف اپنی مرضی یا فیصلہ کے بناپر ہی چھوڑ سکتا ہے، نہ کہ کسی اور مسلمان کے فیصلہ یا رائے کی بناپر اسکو غیر مسلم قرار دیا جائے۔ ایک شخص جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اور کلمہ شہادت کا اعلان کرتا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ، محمد رسول اللہ، اس کو کسی صورت میں کوئی شخص بھی دینِ اسلام سے خارج نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی کوئی اسلامی ادارہ، عدالت یا حکومت جبراً قانون کے ذریعہ ایسے شخص کو کافر یا مُرتد قرار دے سکتی ہے۔

رسول اکرم صلعم نے واضح طور پر ایمان کے بنیادی اصولوں میں اس کو شامل کیا ہے کہ اگر ایک شخص اسلامی کلمہ کا اعلان کرتا ہے تو اس کو کسی گناہ کی بناپر کافر نہیں قرار دیا جا سکتا اور کسی بد عملی کی بناپر اسلام سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔ حدیث میں الفاظ یہ ہیں:

ثَلَاثٌ مِنْ اَصْلِ الْاِیْمَانِ اَلْکَفُّ عَمَّنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَلَا تُکَفِّرْہُ بِذَنْبٍ وَلَا تُخْرِجْہُ مِنَ الْاِسْلَامِ بِعَمَلٍ . . .

(ابو داؤد، کتاب الجہاد، باب 33، حدیث 2532)

"تین باتیں ایمان کی بنیادوں میں شامل ہیں، (اول یہ کہ) ہاتھ روک لو اس سے جو کہے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، اسے کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہ بنانا، اور نہ ہی اسے کسی عمل کی وجہ سے اسلام سے خارج کرنا . . ."

پس ایسے تمام فیصلہ جات یا فتاوٰی کہ اب فلاں شخص کافر اور مُرتد ہو گیا ہے حالانکہ وہ مسلمان ہونے کا اعلان کرے، دینِ اسلام میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

دوسرے مذاہب کے لوگوں کو تبلیغ کرنے کا حق

کچھ مسلمانوں کا خیال ہے کہ مسلمان حکومت کے تحت رہنے والے غیر مسلموں کو گو اپنے مذہبی ارکان کو ادا کرنے کی تو آزادی ہے اور ان کو اس بات کی بھی آزادی ہے کہ وہ اپنے ہم مذہبوں کو مذہبی تعلیم و تربیت دیں، لیکن ان کو اپنے مذہب کی مسلمانوں کو تبلیغ کرنے کی اجازت نہیں۔ لیکن قرآن مجید اس خیال کی متعدد جگہوں پر سختی سے تردید کرتا ہے ۔ ہم دیکھتے کہ جہاں قرآن مجید دوسروں کے عقائد کو غلط قرار دیتا ہے، وہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس کی تائید میں اپنے صحیفہ سے شہادت یا دلیل پیش کریں۔

1- قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (البقرہ، 111:2، النمل، 64:27) "کہہ! اپنی سند لاؤ اگر تم سچے ہو"۔

2- قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ (الانبیاء، 24:21)

"کہہ! اپنی روشن دلیل لاؤ"۔

3- قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا (الانعام، 148:6)

"کہہ! کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے تو اس کو ہمارے لئے نکالو"۔

4- فَأْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (الصّٰفّٰت، 157:37)

"سو اپنی کتاب لاؤ اگر تم سچے ہو"۔

5- اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (الاحقاف، 4:46)

"میرے پاس اس سے پہلے کی کوئی کتاب لے آؤ یا علم کا کوئی نشان لاؤ اگر تم سچے ہو"۔

پس اسلامی شریعت، دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو اس بات سے منع نہیں کر سکتی کہ وہ اپنے عقائد کے ثبوت میں دلائل پیش کریں جب کہ خود قرآن مجید ان سے مطالبہ کر رہا ہے کہ وہ اپنے عقائد کی تائید میں کسی دلیل، علم یا صحیفہ کو پیش کریں۔

علاوہ ازیں، سب جانتے ہیں کہ قرآن مجید اپنے منکروں کو چیلنج کرتا ہے کہ وہ اس، یعنی قرآن مجید، جیسی تحریر تخلیق کر کے لائیں جو اس کی قوتِ بیان، صداقت، تعلیم، اعلیٰ زباندانی یا علم کا مقابلہ کر سکے۔ ملاحظہ کیجئے:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (البقرہ، 2: 23)

"اور اگر تمہیں اس میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندے پر اتارا ہے تو ایک سورت اس جیسی لے آؤ۔ اور اللہ کو چھوڑ کر اپنے مددگاروں کو بلا لو اگر تم سچے ہو"۔

اسی قسم کا چیلنج سورۃ یونس(38:10)اور سورۃ ہود (13:11) میں بھی پایا جاتا ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ اسلام دوسرے مذاہب والوں کو اس بات سے منع نہیں کر سکتا کہ وہ مسلمانوں کے سامنے ایسی تحریریں پیش کریں جو ان کی رائے میں قرآن مجید کے برابر یا اس سے بڑھ کر ہوں۔ اس کے علاوہ وہ کس طرح قرآن مجید کے چیلنج کا جواب دے سکتے ہیں؟

3- گالی گلوچ اور بے جا مذاق اڑانے کا جواب دینے کے متعلق اسلامی تعلیمات

اسلامی تعلیمات کی رُو سے ایک مسلمان اپنے دین اور اس کی مقدّس ہستیوں کے متعلق گالیاں، بے جا مذاق اور ہنسی ٹھٹھے کا جواب صرف ذیل کے طریق پر ہی دے سکتا ہے:

1۔ اگر اسلام کے متعلق کوئی اعتراض یا الزام اس گالی گلوچ یا مذاق کا موجب ہو، تو اس کا جواب تحریر یا تقریر کے ذریعہ دینا چاہیے۔

2۔ جب جواب کسی خاص اعتراض کا دیا جا رہا ہو، ساتھ یہ بھی کوشش کرنی چاہیے کہ عمومی رنگ میں بھی اسلام کی صحیح تصویر پیش کی جائے۔ اس طرح اسلام کی تعلیمات کے متعلق زیادہ روشنی پھیلنے سے، اور ان کے متعلق جہالت کم ہونے سے، غلط فہمی، بدزبانی، اور مذاق کے واقعات میں کمی آتی جائے گی۔

3۔ مسلمانوں کو جب مخالفینِ اسلام سے دین کے متعلق دلآزار اور تکلیف دہ باتوں یا اعتراضات سے صدمہ اور دکھ پہنچے، تو ان کو یہ تعلیم دی گئی ہے:

- بھڑکائے ہوئے جذبات کو انتہائی صبر سے برداشت کیا جائے۔
- بدزبانی کو نظر انداز کیا جائے۔
- ایسے لوگوں کی صحبت سے جو آپ کے دین کے متعلق بدزبانی کر رہے ہوں، وقتی طور پر علیحدگی اختیار کی جائے جب تک وہ ایسی باتیں کرتے رہیں۔
- بدزبانوں اور مذاق اڑانے والوں کو معاف بھی کیا جا سکتا ہے کیونکہ انکی جہالت اور لاعلمی ضروری نہیں کہ انکا قصور ہو۔

یہ تمام باتیں نہایت واضح طور پر قرآن مجید میں بیان کی گئی ہیں اور عملی طور پر یہ طریق رسول اکرم صلعم کی سنت سے ظاہر ہے۔ اسلام مسلمانوں کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ طیش اور غصّہ سے کوئی ردِ عمل کریں، یا سزا دینے، دلوانے کی دھمکیاں دیں، یا کسی مخالفِ اسلام کو جسمانی تشدد کا نشانہ بنائیں۔ یہ بات بالکل جھوٹی اور بے بنیاد ہے کہ اسلام مسلمانوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اگر کوئی مخالف ان کے دین کے متعلق بد زبانی یا تمسخر کرے یا گالی دے، یا کسی رنگ میں ان کے دینی جذبات کو ٹھیس پہنچائے تو اس کو مارا اور قتل کر دیا جائے۔

یہ ایک اصول کے طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ خود قرآن مجید رسول اکرم صلعم کے خلاف الزامات اور بے بنیاد اعتراضات، جو مخالفین اس زمانہ میں پیش کرتے تھے، ان کا ذکر کرتا ہے اور ہم اسکی تلاوت میں انہیں دوہراتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ رسول اکرم صلعم ذہنی بیماری کا شکار تھے یا یہ کہ وہ وحی کو خود ہی بنا لیتے تھے۔ قرآن مجید ایسے تمام اعتراضات اور الزامات کا جواب بھی دیتا ہے لیکن کہیں بھی وہ یہ نہیں کہتا کہ ایسے الزامات لگانے والوں کو جسمانی سزا دی جائے۔ اگر ایسے بے بنیاد الزامات اور اعتراضات پیش کرنے والوں کو جبری خاموش کرنا اسلام کی تعلیم کے مطابق ضروری ہوتا، تو قرآن مجید نے خود کیوں انہیں اعتراضات کو دوہرا کر تمام دنیا کے لئے ہمیشہ طور پر محفوظ کر لیا؟

قرآن مجید گالی گلوچ کے جواب میں صبر کی تلقین کرتا ہے

قرآن مجید میں آیا ہے:

وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (اٰل عمران، 186:3)

"اور ضرور تم ان لوگوں سے جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے اور ان سے جو مشرک ہوئے بہت سے دکھ دینے والی باتیں سنو گے۔ اور اگر صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔"

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ إِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهٖ ۗ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ (البقرہ، 109:2)

"اہل کتاب میں سے بہت سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان کے بعد تمہیں لوٹا کر کافر بنا دیں اپنے حسد کی وجہ سے، اس کے بعد کہ ان پر حق کھل گیا۔ سو معاف کرو اور درگزر کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لائے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

ان دونوں آیات کا حوالہ دیتے ہوئے صحیح بخاری میں یوں درج ہے:

وَكَانَ النَّبِيُّ ﷺ وَأَصْحَابُهُ يَعْفُوْنَ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ وَأَهْلِ الْكِتَابِ كَمَا أَمَرَهُمُ اللّٰهُ، وَيَصْبِرُوْنَ عَلَى الْأَذَى

"نبی ﷺ اور آپ کے صحابہؓ، مشرکین اور اہلِ کتاب کو معاف کر دیا کرتے تھے جس طرح کہ اللہ نے (قرآن مجید میں) انہیں حکم دیا، اور تکلیف دہ باتیں سن کر وہ صبر دکھایا کرتے تھے۔" (بخاری، کتاب التفسیر، تحت سورۃ اٰلِ عمران، حدیث 4465)

اب ہم رسول اکرم صلعم کی تین مزید حدیثوں کا مطالعہ کرتے ہیں جن میں آپؐ نے گالی اور دل آزار باتوں کے جواب میں لوگوں کو صبر کا مظاہرہ کرنے کی نصیحت فرمائی ہے:

1- اِنَّ الْمُسْلِمَ اِذَا كَانَ مُخَالِطًا النَّاسَ وَيَصْبِرُ عَلَى اَذَاهُمْ خَيْرٌ مِنَ الْمُسْلِمِ الَّذِي لَا يُخَالِطُ النَّاسَ وَلَا يَصْبِرُ عَلَى اَذَاهُمْ

"ایسا مسلمان جو دوسرے لوگوں سے ملتا جلتا ہے اور ان کی تکلیف دہ باتوں کو صبر سے برداشت کرتا ہے وہ اس مسلمان سے بہتر ہے جو لوگوں سے ملتا جلتا ہی نہیں اور وہ لوگوں کی گالیوں کو برداشت کرنے میں صبر کا مظاہرہ نہیں کرتا۔" (ترمذی، کتاب صفۃ القیامت والرقائق، حدیث 2696)

یہ کیسی ہی خوبصورت اور شاندار ہدایات ہیں جو آج کل کے جدید زمانے کے لئے نہایت موزوں ہیں جبکہ مختلف خیالات رکھنے والے اور مختلف مذاہب کے لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور ان کا مختلف حوالوں سے آپس میں رابطہ اور تعلق بھی رہتا ہے۔

2- لَيْسَ اَحَدٌ۔اَوْ لَيْسَ شَيْءٌ۔اَصْبَرَ عَلَى اَذًى سَمِعَهُ مِنَ اللّٰهِ، اِنَّهُمْ لَيَدْعُوْنَ لَهُ وَلَدًا، وَاِنَّهُ لَيُعَافِيْهِمْ وَيَرْزُقُهُمْ

"کوئی شخص یا ہستی نہیں جو تکلیف دہ باتوں کو سن کر اللہ سے بڑھ کر صبر دکھائے۔ لوگ اس کا بیٹا بناتے ہیں لیکن پھر بھی وہ انکو عافیت اور رزق دیتا ہے"۔(بخاری، کتاب الادب، حدیث 6099)

یہ حدیث اس امر کی طرف بڑے واضح الفاظ میں اشارہ کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نہایت ناگوار بات سن کر بھی صبر کا کیسا شاندار نمونہ دکھاتا ہے۔ حالانکہ یہاں لوگ اس کا بیٹا بناتے ہیں یا یہ کہ اس کی اولاد ہے۔ یہ عقیدہ اس ہستی کے بارے میں انتہائی غلط ہے اور اس کو عظیم الشان درجہ سے گرا کر پیش کرتا ہے حالانکہ وہ تو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نہ صرف صبر اور انتہائی ضبط کا مظاہرہ کرتا ہے بلکہ ایسے لوگوں کے ساتھ اپنے رحم و کرم اور فراخدلی کا سلوک جاری رکھتا ہے جو اس عظیم ہستی کے بارے میں ایسی نازیبا باتیں کہتے ہیں جو اس کو بے حد ناپسند ہیں۔

3- ایک مرتبہ رسولِ اکرم صلعم نے لوگوں میں مالِ غنیمت تقسیم کیا۔ انصار میں سے ایک شخص نے کہا: "اللہ کی قسم! محمد کا اس تقسیم سے مقصد اللہ کو خوش کرنا نہ تھا"۔ جب اس بات کی اطلاع رسولِ اکرم صلعم کو پہنچی تو آپ کا چہرہ غصّہ سے سرخ ہو گیا۔ اور آپؐ نے فرمایا:

رَحِمَ اللّٰهُ مُوْسٰى، لَقَدْ أُوْذِيَ بِأَكْثَرَ مِنْ هٰذَا فَصَبَرَ

"اللہ تعالیٰ موسیٰ پر رحم کرے۔ انہوں نے اس سے زیادہ تکلیف دہ باتیں سنیں لیکن پھر بھی انہوں نے صبر دکھایا۔" (بخاری، کتاب الادب، حدیث 6059)

رسول اکرم صلعم کو مخاطب کر کے قرآن مجید مزید فرماتا ہے:

1- فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ (طٰهٰ، 130:20، قٓ، 39:50)

"سو اس پر صبر کر جو وہ کہتے ہیں۔"

2- وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا (المزمل، 10:73)

"اور اس پر صبر کر جو یہ کہتے ہیں اور خوبی سے کنارہ کشی کرتا ہو انہیں چھوڑ دے۔"

3- وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا (الاحزاب، 48:33)

"اور کافروں اور منافقوں کی بات نہ مان اور ان کے ایذا دینے کی پروانہ کر اور اللہ پر بھروسہ کر اور اللہ کارساز بس ہے۔"

ان آیات میں مسلمانوں کو اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ وہ لوگوں کی تکلیف دہ باتیں سن کر اپنے مجروح جذبات اور غصّہ کو صبر سے برداشت کریں اور انکی بدزبانی کو نظر انداز کریں۔

گالی دینے والوں کی مجلس سے خاموشی اور وقار سے اٹھ جانا

قرآن مجید مسلمانوں کو یہ بھی ہدایت کرتا ہے:

اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰہِ یُکْفَرُ بِھَا وَیُسْتَھْزَأُ بِھَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَھُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِہٖ (النساء، 140:4)

"اور جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کا انکار کیا جاتا ہے اور ان پر ہنسی کی جاتی ہے تو ان کے ساتھ مت بیٹھو یہاں تک کہ وہ اس کے سوا کسی دوسری بات میں لگ جائیں۔"

وَاِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْھُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِہٖ (الانعام، 68:6)

"اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیتوں کے متعلق بیہودہ باتیں کرتے ہیں تو ان سے منہ پھیر لے' یہاں تک کہ اس کے سوا کسی دوسری بات میں لگ جائیں۔"

ان آیات کا ان حالات سے تعلق ہے جب کسی مجلس میں دینِ اسلام کے متعلق ہنسی، مذاق اور نازیبا باتیں کی جارہی ہوں، نہ کہ سنجیدہ اور مہذب طور پر اسلام پر اعتراض یا سوال کیے جارہے ہوں، تو ایک مسلمان کو چاہیے کہ ایسی محفل سے اٹھ کر چلا آئے، لیکن یہ صرف اس وقت تک جب تک کہ ہنسی مذاق چلتا رہے اور جب موضوع گفتگو بدل جائے تو پھر دوبارہ اس مجلس میں شامل ہونے میں کوئی مذائقہ نہیں۔ یعنی ایسی مجالس میں

لوگوں سے تعلقات اور ملنا جلنا بند نہ کرنا چاہیے بلکہ اسی حد تک لاتعلق رہے جب تک وہ دین کے بارے میں ہنسی اور ٹھٹھا کرتے ہوں۔ ہم پوچھتے ہیں: کیا کوئی دینی تعلیم اس سے زیادہ نیکی اور بلند اخلاق سکھاتی ہے؟ لیکن اس بات کا بھی خیال رہے کہ بدزبانی میں اگر کسی اعتراض کی طرف اشارہ ہے تو اس کا جواب بھی مدلل طریق پر دیا جائے۔ لیکن بہر حال جس مجلس میں ہنسی، ٹھٹھا اور دین کے متعلق نازیبا گفتگو ہو رہی ہو اس سے اٹھ آنا چاہیے یا اس وقت ان لوگوں کی محفل میں بیٹھے رہنا نہیں چاہیے۔

ذیل کی آیت جس میں رسول اکرم صلعم کو مخاطب ہیں، اسکا ذکر صبر کے تعلق میں اوپر کیا جا چکا ہے:

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا

(المزمل، 10:73)

"اور اس پر صبر کر جو یہ کہتے ہیں اور خوبی سے کنارہ کشی کرتا ہوا انہیں چھوڑ دے۔"

یہاں خوبی سے کنارہ کشی کرنے سے مراد ہے کہ مسلمان کا اس موقع پر بھی طرز اور رویہ شائستہ اور باوقار ہو۔ وہ مذاق یا ٹھٹھا کرنے والوں کی طرح رذالت کا مظاہرہ نہ کرے۔

رسولِ اکرم صلعم کی زندگی سے چند واقعات

1۔ سُہیل بن عَمر مکہ میں رسول اکرم صلعم کے مخالفین میں سے نمایاں شخصیت کا مالک تھا۔ وہ قبیلہ قریش کا سرکردہ لیڈر اور ایک اعلیٰ اور قابل مقرّر تھا۔ وہ رسول اکرم صلعم کے خلاف نہایت پر جوش اور پر اثر تقریریں کرتا تھا۔ جنگِ بدر میں مسلمانوں نے اس کو قیدی بنالیا۔ حضرت عمرؓ نے تجویز پیش کی کہ سزا کے طور پر ان کو اجازت دی جائے کہ وہ اس کے آگے کے دانت توڑ دیں تاکہ وہ آئندہ ان دانتوں سے رسول اکرم صلعم کی

مخالفت میں تقریر نہ کر سکے۔ رسول اکرم صلعم نے فوراً فرمایا:

"قطعاً نہیں۔ میں کسی شخص کے جسم کے کسی حصّہ کو نہیں کٹواوں گا کیونکہ اللہ تعالیٰ میرے جسم کے کسی حصّے کو کٹوائے گا اگرچہ میں اس کا نبی ہوں"۔

اسی موقع پر رسولِ اکرم صلعم نے سُہیل کے متعلق یہ پیشگوئی بھی فرمائی کہ ایک دن یہ ایسی بات کہے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔ اس واقعے کے چھ سال بعد فتح مکہ ہوا اور رسولِ اکرم صلعم نے سب مخالفین مکہ کو جنہوں نے مکہ میں رسول اکرم صلعم اور ان کے ساتھیوں کو سخت تکلیف دی تھی اور جس کی وجہ سے مسلمانوں کو اپنے عزیز و اقارب اور گھر بار چھوڑ کر مدینہ ہجرت کرنا پڑی تھی، ان سب کو معاف کرنے کا اعلان کیا اور سُہیل بن عَمر کو بھی معاف کر دیا۔ سُہیل نے رسول اکرم صلعم کی اس فراخدلی اور اعلیٰ اخلاق سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ اور پھر دو سال بعد جب رسول اکرم صلعم کی وفات ہوئی اور مسلمانوں میں سخت مایوسی، بے یقینی اور غم پیدا ہوا۔ تو جہاں حضرت ابو بکرؓ کی تقریر سے مدینہ کے مسلمانوں میں پھر ہمت اور ثابت قدمی ہوئی، مکہ میں سُہیل بن عَمر کی تقریر تھی جس نے وہاں کے مسلمانوں کو مستحکم کیا اور ان میں یہ یقین پھر سے مضبوط ہو گیا کہ رسول اکرم صلعم کی وفات کے باوجود اسلام دینِ حق ہے اور قائم رہے گا۔ اس طرح لوگوں نے رسول اکرم صلعم کی اس پیشگوئی کو بھی اپنی آنکھوں سے پورا ہوتے دیکھا جو انہوں نے سُہیل بن عَمر کے متعلق تقریباً آٹھ سال قبل کی تھی۔[1]

2۔ ایک مرتبہ جب رسول اکرم صلعم نے مسلمانوں میں کچھ مال تقسیم کیا تو بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ آپ نے انصاف نہیں کیا اور ایک شخص نے آپکو مخاطب کر کے

[1] مشہور سیرت 'حیات محمد'، از محمد حسین ہیکل صاحب مصری، باب 'جنگ بدر الکبریٰ'، عربی ایڈیشن، ص287، انگریزی ترجمہ The Life of Muhammad، ایڈیشن آٹھ، 1983ء، ص239۔ نیز سیرت ابن اسحاق، انگریزی ترجمہ The Life of Muhammad by Alfred Guillaume، ص 312 اور 794 تا 795

کہا: اِتَّقِ اللّٰہَ یَا مُحَمَّدُ یعنی: ''اللہ کا خوف کر! اے محمد''۔

جب وہ شخص چلا گیا تو ایک مسلمان نے رسول اکرم صلعم سے اجازت چاہی کہ وہ اس شخص کو جا کر قتل کرے۔ رسول اکرم صلعم نے اس کی اجازت نہ دی بلکہ اس شخص کے متعلق یہ کہہ کر کہ شاید یہ نمازیں ادا کرتا ہے اس کی ایک نیکی کی طرف اشارہ کیا۔ اس مسلمان نے جواب دیا: ''بہت ہیں ایسے جو نمازیں ادا کرتے ہیں، لیکن جو وہ زبان سے کہتے ہیں وہ ان کے دل میں نہیں ہوتا''۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایسا شخص محض ظاہری طور پر مسلمان لگتا ہو گا مگر دل سے مسلمان نہ ہو گا۔ رسول اکرم صلعم نے جواب دیا:

اِنِّی لَمْ اُوْمَرْ اَنْ اَنْقُبَ قُلُوْبَ النَّاسِ، وَلاَ اَشُقَّ بُطُوْنَھُمْ

''مجھے خدا نے یہ حکم نہیں دیا کہ میں لوگوں کے دلوں میں جھانک کر دیکھوں یا ان کا اندر چیر کر دیکھوں''۔ (بخاری، کتاب المغازی، حدیث 4351، اور کتاب الانبیاء، حدیث 3344)

3۔ ایک مرتبہ بعض یہودیوں نے رسول اکرم صلعم کو ''اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ'' کو بگاڑ کر ''اَلسَّامُ عَلَیْکُمْ'' کہا، جس کا مطلب ہے کہ ''تم پر موت وارد ہو''۔ آپؐ کی زوجہ حضرت عائشہؓ نے ان کا منہ توڑ جواب دیا: وَعَلَیْکُمُ السَّامُ وَاللَّعْنَۃُ کہ ''تم پر بھی موت ہو اور لعنت''۔ رسول اکرمؐ نے ان کو کہا:

مَھْلاً یَا عَائِشَۃُ، اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الرِّفْقَ فِی الاَمْرِ کُلِّہِ

''ٹھہرو، عائشہ۔ اللہ تعالیٰ تمام معاملات میں نرمی اور ملائمت پسند کرتا ہے''

اسی حدیث کی ایک اور روایت میں یوں درج ہے:

مَھْلاً یَا عَائِشَۃُ، عَلَیْکِ بِالرِّفْقِ، وَاِیَّاکِ وَالْعُنْفَ وَالْفُحْشَ

"ٹھہرو، عائشہ۔ تم کو نرمی اور ملائمت اختیار کرنی چاہیے اور سختی اور بد زبانی سے پرہیز کرنا چاہیے۔"

رسول اکرم صلعم نے اس موقع پر یہ بھی فرمایا کہ انہوں نے "اَلسَّامُ عَلَیْکُمْ" سن کر اس کا جواب اتنا ہی دیا "وَعَلَیْکُمْ" یعنی "تم پر بھی"۔ جواب میں نہ کسی قسم کے جسمانی حملہ کرنے کی ضرورت ہے، نہ گالی اور بد زبانی کی۔ بلکہ صرف یہی جواب کافی تھا کہ جس بات کی خواہش آپ نے ہمارے لئے کی ہے ہم بھی اسی بات کی خواہش آپ کے لئے کرتے ہیں۔ (بخاری، کتاب الادب، حدیث 6024 اور 6030)

4۔ ایک موقع پر چار اشخاص نے رسول اکرم صلعم کی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہؓ کے کردار کے خلاف بدکاری کے جھوٹے اور بے بنیاد الزامات کی تشہیر کی، جنکا جھوٹا ہونا بالآخر ثابت ہو گیا۔ ان آدمیوں میں سے ایک کا نام مِسطح تھا جو غریب تھا اور حضرت عائشہؓ کے والد حضرت ابو بکرؓ ان کی مالی امداد فرمایا کرتے تھے۔ یہ وہ معزز ہستی تھی جو نہ صرف رسول اکرم صلعم کے اولین ایمان لانے والے عزیز ترین ساتھی تھے بلکہ بعد میں آنحضرت صلعم کے پہلے جانشین مقرر ہوئے۔ اس نہایت تکلیف دہ واقعہ کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے قسم کھائی کہ وہ آئندہ مِسطح کی مالی امداد نہ کریں گے۔ لیکن اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ کے طور پر ذیل کی آیت نازل فرمائی:

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (النور، 22:24)

"اور تم میں سے بزرگی اور (مالی) وسعت والے لوگ یہ قسم نہ کھائیں کہ وہ قریبیوں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو نہیں دیں گے

اور چاہیے کہ معاف کریں اور درگزر کریں، کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہاری مغفرت کرے اور اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔"

اس آیت کو سن کر حضرت ابو بکرؓ فوراً کہہ اُٹھے:

بَلَى، وَاللّٰهِ إِنِّي لَأُحِبُّ أَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لِي

"یقیناً میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت کرے۔"

اور اس کے بعد انہوں نے مِسطَح کی امداد بحال کر دی (بخاری، کتاب الشہادات، حدیث 2661)۔

یاد رہے کہ یہ الزام کسی عام عورت کے متعلق نہ لگایا گیا تھا۔ یہ خاتون رسول اکرم صلعم کی زوجہ مطہرہ تھیں، اور یہ الزام دینِ اسلام کے بانی کے اہل خانہ، جو تمام مسلمانوں کے لئے پاکیزگی کا نمونہ تھے، ان پر ایک بڑی چوٹ تھی۔ ان باتوں کو مدِ نظر رکھیں، تو مندرجہ بالا آیت میں درگزر کرنے کی تعلیم، اور پھر حضرت ابو بکرؓ جو رسول اکرم صلعم کے بعد سب سے عظمت کا مقام رکھتے ہیں، انکا اس تعلیم پر عمل کرنا، یہ درگزر اور فراخدلی کی ایسی عظیم ترین مثال ہے جسکی نظیر ملنا ناممکن ہے۔

مندرجہ بالا واقعات (1) اور (2) میں رسول اکرم صلعم نے اس شخص کو حفاظت فراہم کی ہے جس نے آپؐ کو کوئی گالی دی یا ان کی بے عزتی کی۔ واقعہ (2) میں جس شخص نے رسول اکرمؐ سے بدتمیزی کی، آپ نے اس کے متعلق کسی برے خیال کا اظہار تک بھی نہیں کیا۔ واقعہ (4) میں رسول اکرم صلعم پر اللہ نے وحی نازل کی جس میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کی کہ وہ ایسے شخص کو جس نے آپؐ کی بیوی پر بدکاری کا بے بنیاد الزام پھیلایا تھا، اس کو نہ صرف معاف کر دیا جائے بلکہ اگر اس کو کوئی مالی امداد دی جارہی تھی تو اس امداد کو جاری رکھا جائے۔ اس حکم خداوندی کی پیروی کرتے ہوئے حضرت ابو بکرؓ نے

اس شخص کی مالی امداد کو بحال رکھا جس نے ان کی نہایت چہیتی بیٹی کے خلاف بدکاری کا الزام لگا کر ان کو بدنام کرنے کی کوشش کی۔ ہمارے روشن خیال، جدید اور ماڈرن زمانہ میں بھی یہ باور کرنا تقریباً ناممکن نظر آتا ہے کہ کوئی باپ، مسلمان ہو یا غیر مسلم، اس کو ایسے حالات پیش آئیں جس میں اس کی بیٹی پر بدکاری جیسا سنگین الزام لگے تو وہ الزام لگانے والے کو معاف بھی کر دے اور اس کی مالی امداد کو جاری رکھے!

5۔ ایک مرتبہ ایک یہودی اور ایک مسلمان میں جھگڑا ہوا جب اس یہودی نے اللہ کی قسم اس طرح اٹھائی: ''اس ذات کی قسم جس نے موسیٰ کو (ہر) بشر پر فضیلت دی''۔ مسلمان نے اسے تھپڑ مار کر کہا کہ تو کہتا ہے کہ موسیٰ کو تمام بشروں پر فضیلت ہے جب کہ نبی کریم صلعم ہم میں موجود ہیں۔ یہ واقعہ ایک حدیث میں اس طرح آگے چلتا ہے:

''اس پر وہ یہودی نبی صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: میں (مسلمانوں کے دیئے ہوئے) امن و حفاظت کے عہد کے تحت رہتا ہوں، تو پھر فلاں (مسلمان) کو کیا ہو گا جس نے میرے منہ پر تھپڑ مارا؟ آپؐ نے اس مسلمان سے دریافت کیا: تم نے اس کے منہ پر کیوں تھپڑ مارا؟ اس نے آپؐ کو قصّہ سنایا، تو آپؐ کو غصہ چڑھ گیا، اتنا کہ غصہ آپؐ کے چہرہ پر نظر آنے لگا۔ پھر آپؐ نے فرمایا: اللہ کے انبیاء کو ایک دوسرے پر فضیلت نہ دیا کرو۔'' (بخاری، کتاب الانبیاء، حدیث 3414-3415)

ایک اور حدیث کے مطابق نبی کریم صلعم کا یہ فرمان اس طرح تھا: لَا تُخَيِّرُوْنِيْ عَلٰى مُوْسٰى یعنی ''مجھے موسیٰ پر فضیلت مت دو'' (بخاری، کتاب الخصومات، حدیث 2411)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ مختلف مذاہب میں کس قدر صلح اور اتحاد کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے اور مسلمانوں میں کس قدر برداشت دوسروں کے لئے پیدا کرنا

چاہتے تھے۔ گو ہر مسلمان کا ایمان یہی ہے کہ آپؐ کو تمام انبیاء پر فضیلت ہے، لیکن اس بنا پر دیگر مذاہب کے پیراؤں سے جھگڑا کرنا غلط ہے۔

اس قصّہ میں یہ بھی قابلِ غور ہے کہ اس یہودی کو، جو مسلمانوں کے تحت بطور ذمّی رہ رہا تھا، یہ یقین تھا کہ اگر وہ کسی مسلمان کے خلاف بھی شکایت نبی کریم صلعم کے حضور میں پیش کرے گا تو آپؐ انصاف کا فیصلہ کریں گے۔ مزید یہ کہ آپؐ نے اس مسلمان کو شاباش نہیں دی، کہ تو نے میری عزت کی خاطر یہودی کو تھپڑ مار کر بہت ایمانی غیرت کا مظاہرہ کیا، بلکہ آپؐ نے اسے ہدایت کی کہ اس بات پر یہودی سے مت جھگڑ اور نہ اسے کہہ کہ میں موسیٰ سے افضل ہوں۔

4- جنگ کرنے کی اجازت کب ہے؟

جنگ کرنے کی اجازت صرف اپنی دفاع کے لئے ہے

مسلمانوں کو خاص حالات میں جنگ کرنے کی اجازت ہے۔ اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ رسول اکرم صلعم اور ان کے ساتھیوں کو، جب اسلام مکہ میں آہستہ آہستہ زور پکڑنے لگا، اس وقت سخت اذیت اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا اور اسلام قبول کرنے والوں میں سے ایک سو افراد کے قریب لوگوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔ خود مکہ میں ظلم و ستم میں دن بدن اضافہ ہونے لگا۔ آخر کار رسول اکرم صلعم اور دیگر مسلمانوں کو مدینہ میں پناہ لینا پڑی۔ لیکن وہاں بھی ان کو چین سے نہ رہنے دیا گیا اور دشمن نے تلوار کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ تب اس وقت قرآن مجید نے ان کو جنگ کی اجازت ذیل کی آیات میں دی:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ﴿٣٩﴾ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ (الحج، 22: 39 تا 40)

"ان لوگوں کو (جنگ کی) اجازت دی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور اللہ یقینا ان کی مدد پر قادر ہے۔ وہ جو اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے صرف اس بات پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے نہ ہٹاتا رہتا تو یقینا راہبوں کی

کوٹھریاں اور گرجے اور یہودیوں کی عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے گرادی جاتیں۔"

اس سے ثابت ہے کہ مسلمانوں کو جنگ کرنے کی اجازت اس لئے نہ دی گئی تھی کہ وہ کافروں کو زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور کریں کیونکہ یہ بات ان تمام اصولوں کے خلاف تھی جن کی تعلیم ان کو دی گئی تھی۔ بلکہ یہ اجازت صرف اس لئے دی گئی تھی کہ وہ مذہب کے معاملہ میں آزادی کو قائم کریں۔ تمام قسم کی مذہبی ایذا رسانی کو روکیں اور تمام مذہبی عبادت گاہوں کی حفاظت کریں جن میں مساجد بھی شامل تھیں۔ یہ اجازت صرف اس لئے نہیں دی گئی تھی کہ مسلمان اپنے پر سے ظلم وستم کو روک سکیں اور اپنی مساجد کی حفاظت کر سکیں بلکہ یہودیوں کے معبد خانے اور عیسائیوں کے گرجا گھروں وغیرہ کی بھی حفاظت کر سکیں۔

اس سلسلہ میں یہ بات قابل غور ہے کہ یہ جنگ صرف ان لوگوں کے خلاف کرنے کی اجازت ہے جو مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرتے تھے:

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (البقرہ، 190:2)

"اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں سے پیار نہیں کرتا۔"

اس قرآنی آیت کا یہ ترجمہ صرف کسی مسلمان کا کیا ہوا نہیں بلکہ یہی ترجمہ برطانیہ کے دو عیسائی مترجمینِ قرآن، جارج سیل (George Sale) جو 18ویں صدی میں ہوئے ہیں اور جے ایم راڈویل (J.M. Rodwell) جو 19ویں صدی میں ہوئے ہیں، ان کو بھی مجبوراً یہی ترجمہ کرنا پڑا حالانکہ انہیں اسلام کے بارے میں سخت تعصب تھا اور

انہوں نے اسلام پر یہ الزام پُرزور لگایا کہ یہ تلوار کے ذریعہ پھیلا ہے۔ دونوں مترجموں کا ترجمہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں جو ہم انگریزی سے اردو میں منتقل کر رہے ہیں:

"خدا کے دین کے لئے ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں لیکن حملہ میں پہل کر کے حدود نہ توڑو۔ کیونکہ خدا حدود توڑنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔" (جارج سیل)

"خدا کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں۔ لیکن پہلے ان پر حملہ کر کے ناانصافی نہ کرو۔ اور خدا اس طرح کی ناانصافی پسند نہیں کرتا"۔ (جے۔ایم۔راڈویل)

ساتھ ہی قرآن مجید میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا تھا کہ اُس وقت جنگ بند کر دیں جب ان کے مخالفین ظلم وستم کرنا بند کر دیں:

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾ (البقرہ، 2: 192 تا 193)

"پھر اگر وہ رُک جائیں تو اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لئے ہو۔ پھر اگر وہ رُک جائیں تو سزا ظالموں کے سوائے اور کسی کے لئے نہیں۔"

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ ...
وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳۹﴾ (الانفال، 8: 38 تا 39)

"ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا کہہ دو اگر وہ رُک جائیں تو جو گزر چکا ان کو معاف کر دیا جائے گا... اور ان کے ساتھ جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ (یعنی دین کے لئے ظلم کرنا) نہ رہے۔ اور دین سارا کا سارا اللہ کے لئے ہو۔ پھر اگر رُک جائیں تو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے جو وہ کرتے ہیں۔"

اسلام کی تعلیم ہے کہ مذہب کی بنا پر کوئی ظلم و جبر ہر گز نہیں ہونا چاہیے اور ہر ایک کو اس امر کی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ جو بھی مذہب، عقیدہ یا مسلک اختیار کرنا چاہے کر سکے۔ مندرجہ بالا آیات کے تراجم میں "دین صرف اللہ کے لئے ہو" یا "دین سارا کا سارا اللہ کے لئے ہو" کے الفاظ سے مراد ہے کہ دین کا معاملہ بندے اور خدا کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کا تعلق ہر کسی کے ضمیر اور ذہنی تشفی کی بات ہے جس میں کسی دوسرے کا عمل دخل نہ ہونا چاہیے۔ اس بات کو نوٹ کریں کہ مندرجہ بالا دونوں آیات میں اس شرط کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے کہ اگر وہ "رُک جائیں" تب مسلمانوں کو ان سے جنگ نہ کرنی چاہیے۔ اور ہر آیت میں اس پر دو بار زور دیا گیا ہے، ایک دفعہ جنگ کرنے کے حکم سے پہلے اور دوسری مرتبہ اس کے حکم کے بعد۔

قرآن مجید میں اس بات کا بھی بصراحت ذکر ہے کہ مسلمان جنگ کرنے کے لئے کوئی شوق نہ رکھتے تھے، بلکہ اسے ناپسند کرتے تھے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ (البقرہ، 216:2)

"جنگ تم پر (بطور حکم) لکھی گئی ہے اور وہ تم کو ناگوار ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ تمہیں ایک چیز ناگوار ہو حالانکہ وہ تمہارے لئے اچھی ہو، اور ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لئے بُری ہو۔"

پس مسلمانوں کے لئے جنگ ایک ناگزیر ضرورت بن گئی تھی اور اس میں ان کے لئے کوئی لالچ یا خوشی مقصود نہ تھی۔ وہ حالات جن کی وجہ سے مسلمانوں کو جنگ کرنا پڑی اس کا کچھ اندازہ ان وعدوں اور انعامات سے لگایا جاسکتا ہے جن کا ذکر ذیل کی قرآنی آیت میں کیا گیا ہے:

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾ (اٰلِ عمران، 195:3)

”سو جنہوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے، میں ضرور ان کی تکلیفوں کو ان سے دور کروں گا اور میں ضرور ان کو باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ یہ اللہ طرف سے بدلہ ہے اور اللہ ہی کے پاس اچھا بدلہ ہے۔“

یعنی پہلے مسلمانوں کو ہجرت کرنے پر مجبور کیا گیا، گھروں سے بے گھر کیا گیا اور دین کی وجہ سے ان کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔ ان تمام مصائب اور تکالیف کی وجہ سے ان کو جنگیں لڑنا پڑیں جن میں کافی لوگ شہید ہوئے۔ پھر خود رسول اکرم صلعم کے متعلق دشمن کے منصوبوں کی وجہ سے بھی، کہ آپؐ کو قید، قتل یا جلاوطن کر دیں، مسلمانوں کو جنگ کرنا پڑی۔ ان منصوبوں کا ذکر ذیل کی آیت میں ان الفاظ میں ہے:

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ... (الانفال، 30:8)

”اور جب وہ جو کافر ہوئے تیرے متعلق تدبیریں کرتے تھے تاکہ تجھے قید کریں یا تجھے قتل کریں یا تجھے نکال دیں۔“

ایک اور آیت اس امر پر روشنی ڈالتی ہے کہ کیوں مسلمانوں کو جنگ کرنا پڑی اور ”اللہ کی راہ میں“ لڑنے سے کیا مراد ہے۔ اس میں مومنوں کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿٧٥﴾ (النساء، 75:4)

”اور تمہیں کیا عذر ہے کہ تم اللہ کی راہ میں جنگ نہ کرو اور کمزور مردوں اور عورتوں اور بچوں کے لئے جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم کو اس بستی سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں، اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی ولی بنا اور اپنی جناب سے ہمارا مددگار بنا۔“

پس اللہ کی راہ میں لڑنے سے مراد کمزور اور بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی حفاظت کی خاطر لڑائی ہے جن کی اللہ سے التجا تھی کہ انہیں مکہ شہر کے ظالموں سے بچایا جائے۔

امن کو مقدم کیا جائے

اگر دشمن صلح پر آمادگی پر تیار ہو تو مسلمانوں کو اس پیشکش کو ضرور قبول کرنا چاہیے۔ قرآن مجید کا فرمان ہے:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۔ ۔ ۔ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۔ ۔ ۔ (الانفال، 61:8 تا 62)

”اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تُو بھی اس کی طرف جھک جا۔ اور اللہ پر بھروسہ رکھ ۔ ۔ ۔ اور اگر ان کا ارادہ ہو کہ تجھے دھوکا دیں تو اللہ تجھے بس ہے۔“

خواہ دشمن صلح کی پیشکش کے ذریعہ دھوکا بھی دینا چاہتا ہو اس کے باوجود اس پیشکش کو

قبول کیا جائے اور نتائج کے لئے اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ اس لئے رسول اکرم صلعم نے دشمنوں سے امن کے معاہدے کئے۔ اسی طرح کے ایک معاہدہ کے نتیجہ میں مشہور صلح حدیبیہ ہوئی جس کی شرائط مسلمانوں کے لئے ایک رنگ میں نقصان دہ اور ذلت آمیز تھیں۔ اس معاہدہ کی شرائط کی رو سے اگر ایک کافر اسلام قبول کرلے اور وہ مسلمانوں کے پاس چلا جائے تو مسلمانوں کو اسے کفارِ مکہ کے پاس واپس لوٹانا تھا، مگر ایک مسلمان اسلام چھوڑ کر کفار کے پاس چلا جائے تو کفار نے اس کو مسلمانوں کے پاس نہ لوٹانا تھا۔ معاہدہ کی یہ شرط ان تمام الزامات کو جڑ سے کاٹ دیتی ہے کہ رسول اکرم صلعم نے قوتِ شمشیر کے ذریعہ اسلام کو پھیلایا تھا۔

دشمن کو پناہ دی جائے اگر وہ اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہے

عرب بُت پرستوں کے ساتھ حالتِ جنگ کے دوران قرآن مجید مسلمانوں کو یہ ہدایت دیتا ہے:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ (التوبۃ، 6:9)

"اور اگر ان مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے، تو اس کو پناہ دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پہنچادو۔ یہ اس لئے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو جانتے نہیں۔"

تفسیر ابن جریر جو ایک ہزار سال قبل لکھی گئی، اس میں اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

"الفاظ 'پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پہنچادو' کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ اللہ کا کلام سن لے، اگر وہ اسلام کو قبول کرنے سے انکار کرے اور اللہ کے کلام سے جو اس کو سنایا گیا ہے وہ کوئی نصیحت حاصل نہ کرے، تو اس کو اس کی

حفاظت کی جگہ واپس پہنچا دیا جائے یعنی ایسی جگہ جہاں وہ تیرے اور تیرے ماننے والوں سے محفوظ ہو، اور پھر یہاں تک کہ وہ اپنے گھر میں اور اپنے مشرک لوگوں تک پہنچ جائے"۔

جارج سیل (George Sale) جنہوں نے 18 ویں صدی میں سب سے پہلے قرآن مجید کا انگریزی میں عربی سے براہِ راست ترجمہ کیا اور وہ اسلام کے بڑے ناقد تھے، انہوں نے اس آیت کی تشریح میں یہ نوٹ لکھا ہے:

"آپ اس کو محفوظ طریق پر واپس اس کے گھر پہنچا دیں اگر وہ یہ مناسب نہ سمجھے کہ وہ اسلام کو قبول کرے۔"

اس سے بڑھ کر رواداری کیا ہو سکتی ہے کہ دشمن کے ایک سپاہی کو اس کی درخواست پر حفاظت فراہم کی جائے جب کہ وہ اسلام کے متعلق سیکھ رہا ہے۔ اور اگر وہ اس کو قبول نہ کرنا چاہے تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس کو اپنے گھر حفاظت سے پہنچا دیں جہاں وہ مسلمانوں سے محفوظ ہو اور ان دشمنوں میں شامل ہو جائے جن کے ساتھ مسلمان جنگ کر رہے ہیں۔

بعد کی وحی میں رواداری کی تعلیم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی

بعض لوگ اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی بعد میں نازل شدہ آیات میں دفاعی جنگ کی حد تک رہنے کو منسوخ کر دیا گیا اور مسلمانوں کو اجازت دی گئی کہ وہ لوگوں کے خلاف محض اس وجہ سے جنگ کریں کہ وہ غیر مسلمان ہیں۔ مگر یہ تاریخی لحاظ سے مستند حقیقت ہے کہ رسول اکرم صلعم نے اپنے دشمنوں کو مکمل معافی دے دی جب انہوں نے مکہ فتح کیا اور انہیں اسلام قبول کرنے پر ہر گز مجبور نہ کیا۔ اور یہ واقعہ ان کی بعثت کے 21 ویں سال کا ہے جب کہ ان کی بعثت کا پورا دور 23 سال پر محیط ہے۔ اس سے

صاف ظاہر ہے کہ اسلام کی تعلیمات کہ صرف ان لوگوں سے جنگ کرنے کی اجازت ہے جو مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے میں پہل کریں، اور مذہب کے معاملہ میں ہر ایک کو آزادی ہے، یہ تعلیمات ہمیشہ قائم رہیں اور ان میں کوئی تبدیلی یا تنسیخ نہ آئی۔

اس غلط موقف کی تائید میں کہ بعد میں اسلام کی ان تعلیمات میں تبدیلی آئی، قرآن مجید کی ذیل کی آیت پیش کی جاتی ہے:

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (التوبة، 5:9)

"مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو۔"

اگر اس آیت کے سیاق وسباق کو دیکھا جائے تو یہ بات نہایت واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ یہ بات کہ جہاں کہیں غیر مسلم کو پاؤ قتل کر دو، توڑ مروڑ کر بنائی گئی ہے۔ اسی سورت توبہ کے شروع کی آیات میں بعض مشرک قبائل کو انتباہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے لئے اب ان معاہدوں کی پابندی لازم نہیں آتی جن کو ان قبائل نے بار بار توڑا ہے۔ مندرجہ بالا آیت سے پچھلی دو آیات ملاحظہ فرمائیں:

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ... اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (التوبة، 3:9 تا 4)

"اللہ اور اسکے رسول کی طرف سے لوگوں کو حج اکبر کے دن اعلان کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بیزار ہے...

مگر جن مشرکوں کے ساتھ تم نے عہد کیا پھر انہوں نے تمہارے ساتھ کوئی

کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کو مدد دی تو ان کے ساتھ ان کے عہد کی مدت پورا کر دیں۔ اللہ متقیوں سے محبت رکھتا ہے۔"

اس استثنائی صورت سے صاف ظاہر ہے کہ صرف ان مشرک قبائل پر حملہ کیا جائے جنہوں نے مسلمانوں سے صلح کے معاہدے کو توڑنے میں پہل کی ہو۔ بعد کی آیات میں ان کے اس غلط طریق کار کا واضح طور پر ذکر کیا گیا ہے:

لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً ...

وَ اِنْ نَّكَثُوْۤا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَ طَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْۤا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَاۤ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ﴿۱۲﴾ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْۤا اَيْمَانَهُمْ وَ هَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَ هُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ (التوبۃ، 10:9 اور 12 تا 13)

"وہ کسی مومن کے لئے لحاظ نہیں کرتے، نہ ناطے کا اور نہ ہی عہد کا...

اور اگر وہ اپنے عہد کے بعد اپنی قسموں کو توڑیں اور تمہارے دین میں عیب لگائیں۔ تو کفر کے سرداروں کے ساتھ جنگ کرو، ان کی قسمیں کچھ نہیں، تاکہ وہ باز آئیں۔ کیوں تم ان لوگوں کے ساتھ جنگ نہ کرو جنہوں نے اپنی قسمیں توڑ دیں اور رسول کو نکال دینے کا قصد کیا اور انہوں نے پہلے تمہارے ساتھ (جنگ کرنے میں) ابتداء کی۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے پہلے مسلمانوں پر حملہ کیا اور یہ اس کے باوجود کیا کہ انہوں نے حملہ نہ کرنے کا معاہدہ کیا تھا اور ایسے تمام معاہدوں کو بار بار توڑا۔ صرف یہی وجہ تھی کہ قرآن مجید نے ان حالات میں اعلان کیا کہ اب مسلمان ان معاہدوں کے پابند نہیں ہیں اور ایسے تمام قبائل کے خلاف جنگ کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ آگے آتا ہے:

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ (التوبۃ، 9: 36)

”اور مشرکوں سے تم سب کے سب جنگ کرو جس طرح وہ تم سے سب کے سب جنگ کرتے ہیں۔“

اس میں واضح طور پر مسلمانوں کو اپنی دفاع میں جنگ کرنے کا ذکر ہے۔ اس کے بعد آیت 40 میں مسلمانوں کو کہا گیا ہے کہ اگر انہوں نے رسول اکرم صلعم کی مدد نہ کی تو اللہ تعالیٰ ضرور انؐ کی مدد کرے گا جیسے کہ اس نے اس وقت انؐ کی مدد کی جب آپؐ مکہ سے مدینہ جان بچا کر بھاگ رہے تھے اور دشمن ان کا پیچھا کر رہا تھا اور انؐ کے ساتھ صرف ایک ساتھی تھا (یعنی حضرت ابو بکر)۔ اس سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ اب بھی رسول اکرم صلعم کو یقین تھا کہ ان کو کامیابی کے لئے کسی فوجی طاقت کی ضرورت نہیں جیسا کہ آپؐ کو اس وقت بھی ایسا ہی یقین تھا جب کہ وہ اکیلے دشمن کے گھیرے میں تھے۔

اب سورت توبہ کی آیت 5 کے پہلے حصّہ کی طرف لوٹتے ہیں جہاں یہ درج ہے:

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ

”اور پھر جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو اور ان کو پکڑ لو اور ان کو گھیرے میں لے لو اور ان کے لئے ہر گھات کی جگہ بیٹھو۔“

صاف ظاہر ہے کہ یہ خاص قبائل کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔ اور یہاں ذکر حالتِ جنگ میں دشمن فوجوں سے لڑنے کا ہو رہا ہے کہ ان میں سے کچھ تو جنگ میں مارے گئے اور دوسروں کو قیدی بنالیا گیا۔ یہ انتہائی قابلِ مذمت طریق پر توڑ مروڑ کرنا ہے کہ تصور کرنا کہ اس آیت میں ایک عام اعلان ہے کہ بلا امتیاز غیر مسلمانوں کو قتل کر دیا جائے یا ان پر غیر مشروط طور پر جنگ مسلط کر دی جائے۔ یہی الفاظ ”جہاں ان کو پاؤ قتل کرو“ دشمنوں

کے متعلق قرآن مجید میں وہاں بھی آئے ہیں جہاں مسلمانوں کو پہلی مرتبہ جنگ کرنے کی اجازت دی گئی اور وہاں صاف شرط موجود ہے کہ صرف ان لوگوں سے لڑنے کی اجازت ہے جو خود مسلمانوں کے خلاف جنگ میں پہل کریں۔ جیسا کہ فرمایا:

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ . . . (البقرہ، 2:190 تا 191)

"اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں سے پیار نہیں کرتا۔ اور جہاں ان کو پاؤ انکو قتل کرو اور انہیں نکال دو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے . . ."

یہاں تو کسی کو بھی شک نہیں کہ اس عبارت "جہاں ان کو پاؤ انکو قتل کرو" سے مراد یہ ہے کہ جب وہ تم سے جنگ کرنے میں پہل کر دیں اور تمہارے خلاف لڑ رہے ہوں تو "جہاں ان کو پاؤ انکو قتل کرو"۔ اور بعد کی وحی میں بھی، یعنی سورت التوبہ میں بھی، ایسے الفاظ سے مراد یہی ہے۔

ایک اور ثبوت کہ بعد میں نازل ہونے والی قرآن مجید کی آیات میں پہلی تعلیم کو تبدیل یا منسوخ نہیں کیا گیا یہ ہے کہ موجودہ ترتیب قرآن میں بعض جگہ ابتدائی نازل شدہ آیات اور عرصہ بعد نازل شدہ آیات ایک دوسرے کے قریب قریب آتی ہیں۔ پہلی تعلیم کی ایک مثال سورت 8، الانفال، آیت 61 میں ہے یعنی: وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا، "اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تُو بھی اُس کی طرف جُھک جا"۔ اب سورت 9، التوبہ، آیت 5، جس میں فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ، "مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو" کے الفاظ آتے ہیں، ان دونوں عبارتوں میں صرف 19

آیات کا وقفہ ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سورت 9، التوبہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ سورت 8، الانفال سے منسلک ہے کیونکہ اس کی ابتدا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے نہیں ہوئی جو کہ کسی نئی سورت کے شروع ہونے کی علامت تھی۔ یعنی ہمارے مخالفین کے موقف سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قریباً قریباً ایک ہی سورت میں صرف 19 آیات گزرنے کے بعد قرآن مجید بالکل مخالف تعلیم دیتا ہے۔ پہلے حکم دے کر کہ اگر دشمن صلح کی پیشکش کرے، تو تم بھی صلح کی طرف رجوع کرو، پھر انیس (19) آیات بعد حکم دیتا ہے کہ جہاں بھی تم مشرکوں کو دیکھو، انہیں قتل کر دو!

کم از کم ایک مسلمان کو تو یہ بات قابلِ قبول نہیں ہونی چاہیے، خاص طور پر جب کہ قرآن مجید میں واضح طور پر یہ بیان موجود ہے:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۔ (النساء، 82:4)

"پھر کیا وہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے اور اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت اختلاف پاتے۔"

اب سورت التوبہ، آیت 5 کے دوسرے نصف حصّہ کے ترجمہ کو ملاحظہ فرمائیں:

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵

"پھر اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں تو ان کا رستہ چھوڑ دو۔ یقیناً اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔"

اسلام مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ اگر وہ لوگ جو مسلمانوں کے خلاف جنگ کرتے ہیں اسلام قبول کر لیتے ہیں تو ان کے خلاف تمام مخاصمانہ کارروائیاں ختم کر دیں اور جنگ

کے دوران جو نقصان انہوں نے مسلمانوں کو پہنچایا ہو، اسکی انکو کوئی سزا نہ دی جائے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سارے عرب میں لوگ عام طور پر اسلام قبول کر رہے تھے، اپنی مرضی سے۔ اور اگر دشمن سپاہیوں میں سے کوئی اسی طرح اسلام قبول کرتا تو اس کو اس کے بعد دشمن تصور نہیں کیا جاتا اور اس کے ماضی کے غلط کاموں کو معاف کر دیا جاتا تھا۔

اگلی آیت 6:9 جو پہلے درج کی جا چکی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کو ایسے دشمن کو حفاظت فراہم کرنی چاہیے، جو اسلام کا مطالعہ کرنے کی خواہش ظاہر کرے۔ اور اگر وہ اسلام قبول نہ کرنے کا فیصلہ کرے تو بھی اس کو بحفاظت اپنے لوگوں کے پاس پہنچا دینا چاہیے۔ اس سے بڑا کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اسلام غیر مسلموں کو قتل کی دھمکی دے کر نہیں پھیلایا گیا بلکہ ان کو اس دین کو سمجھنے اور اس کا مطالعہ کرنے کا نہ صرف موقع دیتا ہے بلکہ اس دوران ہر قسم کی حفاظت کی ضمانت بھی دیتا ہے۔

غیر مسلمانوں سے دوستانہ تعلقات

بعض اوقات اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ قرآن مجید مسلمانوں کو منع کرتا ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے دوستانہ تعلقات رکھیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی غیر مذاہب کے لوگوں سے تعلقات رکھنے سے منع کیا گیا ہے اس کا تعلق صرف ایسے لوگوں سے ہے جو مسلمانوں کے ساتھ حالتِ جنگ میں ہوں اور اس کا ذکر واضح طور پر قرآن مجید میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ؕ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ

عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (الممتحنہ، 7:60 تا 9)

"قریب ہے کہ اللہ تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان جن کے ساتھ ان میں سے تمہاری دشمنی ہے محبت پیدا کر دے اور اللہ قادر ہے اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ اللہ تمہیں ان سے نہیں روکتا جنہوں نے تمہارے دین کے بارے میں لڑائی نہیں کی اور تمہیں اپنے گھروں سے نہیں نکالا کہ تم ان سے احسان کرو اور ان سے انصاف کرو۔ اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔ اللہ تمہیں صرف ان لوگوں سے دوستی کرنے سے روکتا ہے جنہوں نے دین کے بارے میں تم سے لڑائی کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالنے میں دوسروں کی مدد کی اور جو ان سے دوستی کرتے ہیں تو وہی ظالم ہیں۔"

اِن قرآنی آیات میں ایک عام اصول بیان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو صرف ان لوگوں سے دوستانہ تعلقات رکھنے سے منع کیا گیا ہے جنہوں نے مسلمانوں سے ان کے دین کی وجہ سے جنگ کی۔ اور پھر شروع کے الفاظ میں یہ امید بھی دی گئی ہے کہ مستقبل میں حالات بدل جانے پر مسلمانوں اور انکے دشمنوں میں دوستی ہو جائے گی۔

اسلام کے معترض ذیل کی آیت بھی قرآن مجید سے پیش کرتے ہیں جس میں دوسرے مذاہب کے لوگوں سے دوستانہ تعلقات رکھنے سے منع کیا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ (المائدہ، 51:5)

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست مت بناؤ۔"

جس قسم کی دوستی کا یہاں ذکر ہے اس کا پتہ سیاق وسباق سے صاف عیاں ہے۔ اسی آیت میں اسکے فوراً بعد یہ الفاظ ہیں: بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ یعنی "وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں"۔ یہاں جن یہودیوں اور عیسائیوں کا ذکر ہے وہ کفار مکہ کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے جنگ کرتے تھے اور اس طرح خود مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار نہیں کرتے تھے۔ اس سے اگلی آیت اس بات کی مزید وضاحت کرتی ہے:

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ (المائدہ، 52:5)

"پس جن (مسلمانوں) کے دلوں میں کمزوری ہے تُو ان کو دیکھے گا کہ ان کی طرف بھاگتے ہیں۔ کہتے ہیں ہم ڈرتے ہیں کہ ہم پر کوئی گردش نہ آجائے۔"

مسلمانوں میں سے کچھ کمزور دل لوگ یہودیوں اور عیسائیوں سے مدد مانگتے تھے کیونکہ ان کو خوف تھا کہ کہیں ان کو مشرکین عرب سے جنگ میں شکست نہ ہو جائے حالانکہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے بالآخر فتح کا وعدہ کیا تھا۔ یہ اس قسم کی دوستی ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو منع فرمایا ہے، جس میں کم دشمنی رکھنے والے لوگوں سے مدد مانگی جائے تاکہ زیادہ سخت دشمنوں سے کسی رنگ میں حفاظت مل سکے اور اس طرح اپنے ایمان کی کمزوری دکھائی جائے۔

صرف چھ آیات کے بعد اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ کس قسم کے یہودیوں اور عیسائیوں کا ذکر 51:5 میں ہے جن کے ساتھ دوستی کے تعلقات نہ رکھے جائیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ الْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى

الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ؕ (المائدہ، 57:5 تا 58)

"اے لوگوں جو ایمان لائے ہو، ان میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی ان لوگوں کو دوست نہ بناؤ جو تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل بناتے ہیں اور نہ کافروں کو۔ اور اللہ کا تقویٰ کرو اگر تم مومن ہو۔ اور جب تم نماز کے لئے بلاتے ہو تو اس کو ہنسی اور کھیل بناتے ہیں۔"

یہاں الفاظ "ہنسی اور کھیل بناتے ہیں"، جو دو مرتبہ آئے ہیں، وہ قابلِ توجہ ہیں۔

بعض عبارات جو سورت المائدہ، آیت 51 سے پہلے اور بعد میں آتی ہیں وہ نہایت واضح طور پر بتاتی ہیں کہ مسلمانوں کو یہودیوں اور عیسائیوں سے دوستانہ تعلقات سے نہیں روکا گیا۔ ہمارے معترضین کی متعصب آنکھیں اس آیت کو جو تین آیات قبل آتی ہے، یعنی آیت 48، اسکو نظر انداز کر گئی ہیں۔ اس کا حوالہ ہم پہلے بھی دے چکے ہیں۔ اس میں دوسرے مذاہب کے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے یہ ذکر آتا ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۙ﴿۴۸﴾ (المائدہ، 48:5)

"ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور طریق مقرر کیا اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک ہی گروہ (دینی امّت) بنا دیتا۔ لیکن (وہ چاہتا ہے) کہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہارے جوہر پرکھے۔ سو نیکیوں کو آگے بڑھ کر لو۔ تم سب کو اللہ کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے۔ پس جن باتوں میں تم اختلاف کرتے تھے وہ تمہیں بتا دے گا۔"

اس میں تمام اہلِ مذاہب کو نصیحت کی گئی ہے، جن میں مسلمان بھی شامل ہیں، کہ نیک کام

کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جائیں کیونکہ تمام مذاہب کی شریعت اور طریقِ زندگی کا اصل مقصد بھی یہی ہے کہ اس کے ماننے والے نیک اعمال سر انجام دیں۔ یہ نصیحت، کہ دوسروں کے نیک کاموں کو دیکھ کر ان سے انہی کاموں میں مقابلہ کرو، اس رویہ کے واضح طور پر متضاد ہے کہ دوسرے مذاہب سے دوستانہ تعلقات نہ رکھے جائیں۔

سورت المائدہ کی متنازعہ فیہ آیت 51 سے ذرا آگے قرآن مجید فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الصّٰبِـُٔوْنَ وَ النَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٩﴾ (المائدہ، 69:5)

"وہ جو ایمان لائے اور وہ جو یہودی ہوئے اور صابی اور عیسائی، جو کوئی اللہ اور آخری دن پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے، تو اُن پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غم کریں گے۔"

اس آیت میں مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کو ایمان کے اعتبار سے ایک ہی زمرہ میں رکھا گیا ہے کہ وہ سب خدا پر اور یوم حساب پر ایمان رکھتے ہیں، اور یہ وعدہ دیا گیا ہے کہ ان دونوں اصولوں پر سچا ایمان نجات کا موجب ہو گا۔ یہ امر علیٰحدہ ہے کہ وہ کونسا مذہب ہے جسکی تعلیم ان دونوں اصولوں پر انسان کو کامل طور قائم کر سکتی ہے۔

آگے اس بات کے بیان کے بعد کہ مسلمانوں کے خلاف دشمنی میں یہودی اور بت پرست عرب انتہائی سخت گیر ہیں، قرآن مجید فرماتا ہے:

وَ لَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَ رُهْبَانًا وَّ اَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٨٢﴾ (المائدہ، 82:5)

"اور ان کے لئے جو ایمان لائے، دوستی میں (دوسروں میں سے) قریب ترین تُو ان کو پائے گا جو کہتے ہیں کہ ہم عیسائی ہیں۔ یہ اس لئے کہ ان میں عالم اور راہب ہیں اور اس لئے کہ وہ تکبر نہیں کرتے۔"

یہاں اس بات کا بطور خاص ذکر ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ دوسروں میں سے "دوستی میں قریب ترین" عیسائی ہیں۔ اس لئے سورت المائدہ کی متنازعہ فیہ آیت 51 میں عبارت کو کسی صورت میں عمومی مطلب نہیں دیا جاسکتا کہ مسلمانوں کو عیسائیوں سے بالکل دوستانہ تعلقات نہیں رکھنے چاہییں۔

جہاں تک یہودیوں کا تعلق ہے اس سورت میں پہلے ذکر آچکا ہے کہ انہوں نے اپنی قدیم تاریخ میں اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کو توڑا اور تورات کی تعلیمات سے لاپرواہی کی اور ان کی خلاف ورزی کی۔ اس کا نتیجہ قرآن مجید میں اس طرح دیا ہوا ہے:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ ...
وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (المائدہ، 5: 13)

"سو ان کے اپنا عہد توڑنے کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دل سخت کر دیئے... اور ان میں سے تھوڑے لوگوں کے سوائے تُو ان کی خیانت پر خبر پاتا رہے گا۔ سو ان کو معاف کر اور درگزر کر۔ اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔"

اگر قرآن مجید مسلمانوں کو یہ تعلیم دیتا کہ کسی یہودی سے دوستانہ تعلقات نہ رکھو، تو اُسی سورت میں مسلمانوں کو یہ تعلیم کیسے دے سکتا تھا کہ تم ان کو معاف کر دو اور درگزر کرو باوجود اس کے کہ وہ تمہارے ساتھ خیانت کرتے ہوں؟

مندرجہ بالا صرف ایک ہی ایسی آیت نہیں جس میں مسلمانوں کو یہودیوں اور عیسائیوں کو معاف کرنے کی نصیحت کی گئی۔ اس سلسلہ میں ایک اور آیت ملاحظہ فرمائیں:

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٠٩﴾ (البقرہ، 109:2)

''اہلِ کتاب میں سے بہت سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان کے بعد تمہیں لوٹا کر کافر بنا دیں اپنے حسد سے، اس کے بعد کہ ان پر حق کھل گیا۔ سو معاف کرو اور در گزر کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لائے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

اس آیت میں ''یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لائے'' کے الفاظ میں یہ پیشگوئی کی گئی ہے کہ اسلام ان مخالفین کی زندگیوں میں کامیابیاں حاصل کرے گا اور آخر کار انہیں اپنی ان کوششوں کو چھوڑ دینا ہوگا کہ وہ مسلمانوں کو کفر کی طرف لوٹا دیں، کیونکہ انکی یہ کوششیں بے کار ثابت ہو گئی ہونگی۔

ایک اور بات بھی بہت قابلِ ذکر ہے، کہ قرآن مجید میں کئی مقامات پر یہودیوں اور عیسائیوں میں نیک لوگوں کی موجودگی کا ذکر کیا گیا ہے:

1- لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿١١٣﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١١٤﴾ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿١١٥﴾ (آلِ عمران، 113:3 تا 115)

"وہ لوگ سب ایک جیسے نہیں۔ اہل کتاب میں سے ایک جماعت (حق پر) قائم ہے جو اللہ کی آیتوں کو رات کی گھڑیوں میں پڑھتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں۔ وہ اللہ اور آخری دن پر ایمان لاتے ہیں اور اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں اور نیکیوں کو جلدی لیتے ہیں اور وہی نیکوں میں سے ہیں۔ اور جو کچھ وہ نیکی کریں گے تو اس کی ناقدری نہیں کی جائے گی۔ اور اللہ جانتا ہے کہ متقی کون ہیں۔"

2- وَ مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ مَنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِقِنۡطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيۡكَ ۚ وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِدِيۡنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيۡكَ اِلَّا مَا دُمۡتَ عَلَيۡهِ قَآئِمًا ؕ (آلِ عمران، 75:3)

"اور اہل کتاب میں سے وہ ہے کہ اگر تو اس کو مال کے ڈھیر پر امین بنائے تو وہ اسے تجھے واپس دے دے۔ اور ان میں سے وہ بھی ہے کہ اگر تو اسے ایک دینار پر امین بنائے تو وہ اسے تجھے واپس نہ دے سوائے اس کے کہ تو اس کے سر پر کھڑا رہے۔"

3- وَ مِنۡ قَوۡمِ مُوۡسٰۤى اُمَّةٌ يَّهۡدُوۡنَ بِالۡحَقِّ وَ بِهٖ يَعۡدِلُوۡنَ ﴿۱۵۹﴾ (الاعراف، 159:7)

"اور موسیٰ کی قوم میں سے ایک جماعت ہے جو حق کے ساتھ ہدایت دیتے اور اس کے ساتھ عدل کرتے ہیں۔"

4- وَ قَطَّعۡنٰهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ اُمَمًا ۚ مِنۡهُمُ الصّٰلِحُوۡنَ وَ مِنۡهُمۡ دُوۡنَ ذٰلِكَ ۫ (الاعراف، 168:7)

"اور ہم نے انہیں (یعنی یہودیوں کو) فرقے بنا کر دنیا میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ کچھ ان میں صالح ہیں اور کچھ اور طرح کے ہیں۔"

مسلمانوں کو ایسے نیک یہودیوں اور عیسائیوں کی تعریف اور عزت کرنی اور انکا احترام کرنا چاہیے چہ جائکہ ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے سے انکار کریں۔

ایک جگہ پر قرآن مجید یہودیوں اور عیسائیوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ خدائے واحد پر ایمان لانے کے مشترک عقیدہ کی طرف آئیں اور اس پر عمل کریں:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾
(آلِ عمران، 64:3)

"کہہ: اے اہلِ کتاب اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں، اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوائے رب بنائے۔ اور اگر وہ پھر جائیں تو تم گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔"

اس میں ایک دوستانہ دعوت کے سوا اور کوئی مقصد نہیں جس میں عیسائیوں اور یہودیوں کو اسلام کے قریب لانے کی کوشش ہے گو وہ اپنے اپنے دین پر قائم رہیں۔ اور اگر وہ لوگ اس دعوتِ توحید کو قبول نہ کریں اور شرک پر قائم رہیں، تو مسلمانوں کو صرف یہ کہنا ہے کہ "تم گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں"، کہ ہم توحیدِ الٰہی پر کامل طور پر ایمان رکھتے ہیں۔

آخری بات یہ ہے، لیکن پھر بھی یہ بات اہم ہے، کہ قرآن مجید مسلمانوں کو اجازت دیتا ہے کہ پہلے نازل شدہ دینوں کو ماننے والوں کے ساتھ، اور بطور خاص یہودیوں اور عیسائیوں سے، سماجی تعلقات قائم کریں۔ یہ اجازت سورت المائدہ کی آیت 5 میں موجود ہے، وہی سورت جس کی آیت 51 کے متعلق یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو یہودیوں اور عیسائیوں سے دوستانہ تعلقات رکھنے سے منع کرتی ہے۔ فرمایا:

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۖ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ (المائدہ، 5:5)

"آج تمہارے لئے ستھری چیزیں حلال کی گئیں اور ان لوگوں کا کھانا جن کو کتاب دی گئی تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لئے حلال ہے۔ اور پاک دامن مومن عورتیں اور ان میں سے پاک دامن عورتیں جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی جب تم ان کو ان کے مہر دے دو، نکاح میں لانے والے، نہ کھلی بدکاری کرنے والے اور نہ چھپی دوستی رکھنے والے۔"

اس آیت کے پہلے حصّہ میں کھانوں کا ذکر ہے جس سے مراد سماجی میل ملاپ ہے۔ کچھ مذاہب دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ کھانے پینے سے منع کرتے ہیں۔ یہ آیت مسلمانوں کو اجازت دیتی ہے کہ وہ دوسرے مذاہب والوں کے تیار کردہ کھانا کھا سکتے ہیں۔ خاص طور پر اس ضمن میں یہودیوں اور عیسائیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہاں ایسا کھانا ہو جو اسلام کی رو سے حلال ہو۔ اور اسی طرح مسلمان اپنا کھانا دوسرے مذاہب والوں کو پیش کر سکتے ہیں جس کو دوسرے کھانا پسند کریں۔ اور اسی طرح مسلمان یہودیوں اور عیسائیوں اور دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے میزبان اور مہمان دونوں طرح ہو سکتے ہیں اور اس کی قرآن مجید صریح اجازت دیتا ہے۔ ان تمام باتوں کے مدِ نظر یہ الزام کہ قرآن مجید مسلمانوں کو دوسرے مذاہب کے لوگوں سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے سے منع کرتا ہے، یہ کسی طرح درست نہیں ہو سکتا ہے۔

اس آیت کا دوسرا حصّہ اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ جس طرح ایک مسلمان

مرد ایک پارسا مسلمان عورت سے شادی کر سکتا ہے اسی طرح وہ ایک عیسائی یا یہودی عورت سے بھی شادی کر سکتا ہے جو اُسی اخلاقی اور پاکبازی کے معیار پر پورا اترتی ہو جو کہ ایک مسلمان عورت پر واجب ہے۔ کوئی بھی دیگر انسانی تعلقات، خاوند اور بیوی کے مابین تعلقات سے زیادہ محبت آمیز، دوستانہ اور قریب ترین نہیں ہوسکتے اور اس قسم کے تعلقات کو قرآن مجید مسلمان مرد کو یہودی یا عیسائی عورت سے قائم کرنے کی نہایت وضاحت سے اجازت دیتا ہے۔

ضمناً اس بات کا ذکر بھی ہو جائے کہ اس آیت میں یہ بات بھی تسلیم کی گئی ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں میں بھی ایسی عورتیں موجود ہیں جو اسی اخلاقی بلندی اور پاکبازی کو برقرار رکھتی ہیں جن کی پاسداری کی ایک مسلمان عورت کو ہدایت کی گئی ہے۔

اس سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہودیوں، عیسائیوں اور دیگر مذاہب کے لوگوں سے مسلمانوں کو دوستانہ تعلقات استوار کرنے سے منع کرنے کی بجائے، قرآن مجید تو درحقیقت ان رکاوٹوں کو دور کرتا ہے جو مذہبی بنا پر ایسے تعلقات پیدا کرنے کی راہ میں کھڑی ہوتی ہیں۔

5- جہاد کا صحیح مفہوم

عربی لفظ جہاد کا مطلب کوشش کرنا یا کسی ناپسندیدہ اور غلط چیز یا رویہ کے خلاف بھرپور جدوجہد کرنا ہے۔ لیکن اس سے ہرگز مراد محض جنگ یا اسلحہ کے ساتھ لڑائی کرنا نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلحہ سے لڑائی کو بھی جہاد کہا جاتا ہے۔ لیکن اس مفہوم میں اس لفظ کا استعمال اسی طرح ہے جس طرح انگریزی لفظ struggle بمعنی کوشش، جنگ کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ اسلامی تعلیمات میں جہاد کسے کہتے ہیں، ہمیں دیکھنا ہوگا کہ یہ لفظ قرآن مجید میں کن معانی میں استعمال ہوا ہے۔

قرآن مجید میں جہاد کا لفظ اتنے وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے کہ وہ لوگ جو اسلام کے مخالف تھے ان کی اس سعی کو کہ مسلمان خدائے واحد کے علاوہ دوسری چیزوں کی عبادت کریں اس کے لئے بھی 'جہاد' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے:

وَإِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا (العنکبوت، 8:29، نیز دیکھیں لقمان، 15:31)

"اور اگر وہ تجھ پر زور دیں کہ تو میرے ساتھ (دوسروں کو) شریک کرے جس کا تجھے علم نہیں تو ان کی بات نہ مان۔"

عربی کے جس لفظ کا ترجمہ یہاں "زور دیں" کیا گیا ہے، اسکا لفظی ترجمہ "جہاد کریں" ہے۔ اس لفظ کا یہاں ان معنوں میں استعمال یہ ظاہر کرتا ہے کہ ایک تو یوں جہاد کا مطلب جنگ نہیں ہے کیونکہ اس موقع پر کوئی جنگ نہیں لڑی جارہی۔ دوسرے یہ کہ یہاں مسلمانوں کے مخالفین کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف جہاد کررہے ہیں، یعنی قرآن کی اصطلاح میں جہاد غیر مسلمان بھی مسلمانوں کے خلاف کرسکتے ہیں!

قرآن مجید میں ہم دیکھتے ہیں کہ جہاد یا کوشش جس کی مسلمانوں سے توقع کی جارہی

ہے کہ وہ کریں، وہ ذیل کی اقسام کی ہے:

1۔ اللہ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش تاکہ بُری خواہشات پر قابو پاکر اپنی اخلاقی اور روحانی طور پر اصلاح اور ترقی کی جائے۔

2۔ مشکل حالات میں اسلام پر ثابت قدمی سے قائم رہنا اور ظلم و ستم میں صبر اور استقامت دکھانا۔

3۔ اسلام کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے کوشش کرنا اور اس سلسلہ میں اپنا وقت، قوت اور روپیہ خرچ کرنا۔

4۔ مسلمانوں کی دفاع میں لڑائی کرنا یا لڑائی میں امداد فراہم کرنا، مگر ان حالات میں جبکہ اسلام مسلمانوں کو ہتھیار کے ساتھ جنگ کرنے کی اجازت دے۔

اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے جہاد

اس کا ذکر ذیل کی آیت میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۶۹﴾ (العنكبوت، 69:29)

”اور جو لوگ ہمارے لئے کوشش کرتے ہیں ہم یقیناً انہیں اپنے رستوں پر چلائیں گے اور اللہ یقیناً نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

اصل عربی عبارت میں جس لفظ کا اردو میں ترجمہ ”کوشش“ کیا گیا ہے وہ لفظ ’جہاد‘ سے ہے۔ یہ واضح ہے کہ اسکا مطلب اپنی اخلاقی اور روحانی اصلاح لانے کے لئے کوشش کرنا ہے۔ اس بات کو بھی ذہن میں رکھیں کہ جہاد سے متعلقہ لفظ ’مجاہدہ‘ ہے جو کہ روحانی ریاضت، مثلاً روزے، کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

مندرجہ ذیل آیت میں اسی جہاد کا ذکر کیا گیا ہے جہاں لفظ جہاد (جَاهِدُوْا اور جِهَادِهٖ) کو "کوشش" کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے:

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ ... فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ (الحج، 78:22)

"اور اللہ کی راہ میں کوشش کرو جو اس کی راہ میں کوشش کا حق ہے۔ اس نے تمہیں چن لیا ہے اور دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی گئی... سو نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ اور اللہ کو مضبوطی سے پکڑو"۔

اسی طرح ذیل کی آیت ہے:

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (العنکبوت، 6:29)

"اور جو کوئی جہاد کرتا ہے، وہ اپنی ہی جان کی بھلائی کے لئے جہاد کرتا ہے۔ اللہ یقیناً جہانوں سے بے نیاز ہے۔"

یہ دونوں آیات اس وقت رسول اکرم صلعم پر نازل ہوئیں جب آپ سخت ظلم و ستم کے حالات میں مکہ میں رہ رہے تھے۔ اس لئے یہاں جہاد کرنے کا حکم لڑائی کرنے کے معنوں میں استعمال نہیں ہو رہا۔ پہلی آیت میں کوشش یا جہاد کو نماز، صدقات دینے اور خدا سے مضبوط تعلق باندھنے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

جہاد صبر اور برداشت کے معنوں میں

ان معنوں میں ذیل کی آیت میں لفظ جہاد استعمال ہوا ہے:

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَ صَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾ (النحل، 110:16)

"پھر تیرا رَبّ، ان لوگوں کے لئے جنہوں نے اس کے بعد کہ انہیں دکھ دیا گیا ہجرت کی، پھر جہاد کیا اور صبر کیا۔ یقیناً تیرا رَبّ اس کے بعد بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔"

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جبکہ رسول اکرم صلعم ابھی مکہ ہی میں مقیم تھے اور مسلمان ہجرت کر رہے تھے لیکن ابھی انہیں جنگ کرنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ ان حالات میں ان کو سخت کوشش یا جہاد کا حکم ان معنوں میں تھا کہ وہ تمام مشکلات اور مصائب کو صبر کے ساتھ برداشت کریں۔ یہاں جہاد سے ہرگز مراد جنگ کر کے لڑنا نہ تھا۔

انہیں معنوں میں لفظ جہاد ایک نہایت مشہور حدیث میں بھی استعمال ہوا ہے جس میں رسول اکرم صلعم فرماتے ہیں کہ:

اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ

"سب سے افضل جہاد ایک ظالم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے" (ابو داؤد، کتاب الملاحم، باب الاَمْرِ وَالنَّهِی۔ یہ حدیث ابن ماجہ اور نسائی میں بھی ہے۔)

یہاں ایک نیک مقصد کے لئے سچ بولنا، جب کہ یہ بہت جرأت کا کام ہو، اس کو جہاد کہا گیا ہے۔ اور رسول اکرم صلعم نے اس کو افضل جہاد قرار دیا ہے۔

اسلام کی تبلیغ کے لئے جہاد

سورت النحل کی آیت 110 جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، اس میں پیغامِ اسلام کی تبلیغ کو جہاد میں شامل کیا گیا ہے، اس لئے کہ اسی کی بنا پر مسلمانوں کو اذیت دی جا رہی تھی اور اس راہ

میں تکلیف اٹھانا جہاد ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کو تبلیغ کے سلسلہ میں استقامت کی تلقین کی جارہی ہے اور نتائج کے لئے صبر دکھانے پر زور دیا جارہا ہے۔ اس دور میں رسول اکرم صلعم کو یہ حکم بھی دیا گیا:

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ﴿٥١﴾ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿٥٢﴾ (الفرقان، 25:51 تا 52)

"اور اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک ڈرانے والا بھیج دیتے۔ سو کافروں کی بات نہ مان اور اس (قرآن) کے ساتھ ان سے وہ جہاد کر جو بڑا جہاد ہے۔"

اس آیت میں "اس کے ساتھ" کے الفاظ میں خود قرآن مجید ہی مراد ہے۔ یہاں جس جهاداً كبيراً، یعنی بڑے جہاد کا ذکر ہے، جسکو کرنے کا رسول اکرم صلعم کو حکم دیا جا رہا ہے وہ قرآن مجید کی سچائی کو پھیلانے کا کام ہے۔ اور ہر ایک مسلمان کا فریضہ بھی یہی بڑا جہاد ہے۔ یہ آیت بھی رسول اکرم صلعم کے مکہ میں قیام کے دوران ہی نازل ہوئی تھی اس لئے اس میں جو "بڑے جہاد" کا حکم دیا گیا ہے، اور لفظ جہاد کو اس آیت میں دو مرتبہ استعمال کیا گیا ہے (جَاهِدْ اور جِهَادًا)، اس سے مراد مسلح لڑائی کسی صورت نہیں ہو سکتی۔

ان کے علاوہ مدینہ میں مدت بعد کی آیات میں لفظ 'جہاد' ان معنوں میں استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد مسلح لڑائی ہر گز نہیں ہے، مثلاً:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ (التوبة، 9:73، التحريم، 66:9)

"اے نبی کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان کے مقابلہ میں شدت اختیار کر۔"

منافق وہ گروہ تھا جو ظاہری طور پر مسلمانوں کی جمعیت کا حصّہ تھا لیکن نازک موقعوں پر مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ دیتا تھا۔ یہ لوگ اسلام کی دفاع کے وقت ایمان کے اخلاص کا مظاہرہ نہ کرتے تھے۔ مگر ان کے خلاف کبھی جنگ نہ کی گئی۔ ان کے خلاف یہی جہاد تھا کہ ان کو اسلام کی سچائی کو ماننے پر آمادہ کیا جائے۔ اسی قسم کی کوشش یا جہاد کا ذکر کفار مکہ کے لئے یہاں کیا گیا ہے۔ دس سے زیادہ قرآن مجید کے انگریزی تراجم نے مندرجہ بالا دو آیات میں جہاد کا ترجمہ strive hard یعنی "خوب کوشش" کیا ہے اور اس سے مراد جنگ نہیں لیا۔

ایک مثال ان آیات میں سے جو مدینہ میں نازل ہوئیں جہاں لفظ جہاد کے معنی جنگ یا لڑائی نہیں ہیں ذیل میں ہے:

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾

(الصف، 11:61)

"تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کے رستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرو۔ یہ تمھارے لئے بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو۔"

اس آیت کے تین آیات کے بعد میں یوں فرمایا گیا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ (الصف، 14:61)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کے (دین کے) مددگار بن جاؤ جس طرح عیسٰی ابن مریم نے حواریوں سے کہا تھا: اللہ کے لئے کون میرے مددگار

ہیں؟ حواریوں نے کہا: ہم اللہ کے (دین کے) مدد گار ہیں۔"

جس بات کو آیت 11 میں اللہ کی راہ میں جہاد کہا گیا ہے، اسی کو آیت 14 میں اللہ کا مدد گار بننا کہا گیا ہے، اور اس طرح مدد گار بننا جس طرح حضرت عیسیٰؑ ابن مریم کے حواریوں نے اللہ کی راہ میں مدد گار بننے کا اقرار کیا۔ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کو، عیسائی ذرائع یا اسلامی ذرائع کے مطابق، یہ ہر گز نہیں کہا گیا تھا کہ وہ کسی لڑائی میں اسلحہ کے ساتھ جنگ کریں۔ انہوں نے حضرت مسیح کے پیغام کی تبلیغ کے فریضہ کو مصائب، اذیت اور انتہائی مشکل حالات میں ادا کیا۔ یہی "اللہ کے راستے میں جہاد" ہے جسکا ذکر آیت 11 میں ہے۔

جہاد بشکل جنگ

قرآن مجید میں لفظ جہاد کا استعمال جنگ یا لڑائی کے معنوں میں بھی ہوا ہے۔ مثال کے طور پر:

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ (التوبۃ، 41:9)

"ہلکے اور بوجھل نکل پڑو۔ اور اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔"

وَ اِذَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ جَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَ قَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ ... لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ (التوبۃ، 86:9 تا 88)

"اور جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ ہو کر جہاد کرو تو ان میں فراخی والے تجھ سے اجازت مانگتے ہیں اور

کہتے ہیں کہ ہمیں چھوڑ، ہم بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ رہ جایں۔ . . لیکن رسول اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ایمان لائے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرتے ہیں۔"

حدیث میں ایسے واقعات کا بھی ذکر ہے کہ جب کچھ مسلمانوں نے جنگ کرنے کے لئے جہاد میں شرکت کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو رسول اکرمؐ نے انہیں کہا کہ ان کا جہاد بعض دوسرے فرائض ادا کرنا ہے جن کا تعلق لڑائی سے نہ ہوگا۔ اسکی ہم دو مثالیں صحیح بخاری سے پیش کرتے ہیں:

1- حضرت عائشہؓ نے پوچھا: "یارسول اللہ، ہم جہاد کو سب سے افضل عمل سمجھتے ہی، تو کیا ہم جہاد نہ کریں؟" آپؐ نے فرمایا: لاَ، لَكِنَّ أَفْضَلَ الْجِهَادِ حَجٌّ مَبْرُورٌ "نہیں، افضل جہاد، حج کو صحیح طریق پر ادا کرنا ہے" (بخاری، کتاب الحج، حدیث 1520)

2- ایک شخص نبی کریمؐ کے پاس آیا اور جہاد کرنے کی اجازت مانگی۔ آپؐ نے پوچھا: کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟ اس شخص نے جواب دیا: جی ہاں۔ آپؐ نے فرمایا: فَفِيهِمَا فَجَاهِدْ "تب ان کے لئے جہاد کر"۔ (بخاری، کتاب الجہاد، حدیث 3004)

"ان کے لئے جہاد" کے الفاظ کا صرف ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے اور ہر ایک نے بھی یہی سمجھا ہے کہ والدین کی خدمت میں اپنی قوت صرف کرو۔ یہاں رسول اکرمؐ نے حج یا والدین کی خدمت کو مجازی رنگ کا جہاد نہیں پیش کیا، نہ ہی اسے بطور ایک کم درجہ کے جہاد کے، جو ان لوگوں کے لئے ہو جو حقیقی جہاد کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ بلکہ آپؐ نے اسے ان لوگوں کے لئے صحیح معنوں کا جہاد ہی کہا ہے۔

ایک اور نہایت بصیرت افروز واقعہ بخاری میں درج ہے جو کہ رسول اکرمؐ کی وفات کے قریباً ساٹھ سال بعد ہوا جب اس زمانہ کی اسلامی حکومت کے خلاف حضرت ابن زبیرؓ

نے کچھ مسلمانوں کی سرکردگی کرتے ہوئے بغاوت کر دی۔ حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ جو قرآن مجید کی تفسیر کے بارے میں عظیم سند تسلیم کیے جاتے ہیں اور حضرت عمرؓ کے بیٹے تھے، ان سے بعض لوگوں نے اصرار کیا کہ وہ اس بغاوت میں ان کا ساتھ دیں کیونکہ وہ اس کو جہاد سمجھتے تھے۔ اس بارے میں ذیل کی روایت میں دعوتِ فکر ہے:

ایک شخص ابن عمرؓ کے پاس آیا اور کہا: ''ایک سال آپ حج کے لئے جاتے رہتے ہیں اور دوسرے سال آپ عمرہ کے لئے جاتے رہتے ہیں۔ اور پھر بھی آپ نے اللہ کی راہ میں جہاد کو ترک کر دیا ہے۔ آپ کو بخوبی علم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاد کرنے کی کتنی ترغیب دی ہے۔'' ابن عمرؓ نے کہا: ''میرے بھتیجے! اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: اللہ پر اور اسکے رسول پر ایمان، پانچ نمازیں، رمضان میں روزے، زکوۃ کا ادا کرنا اور اللہ کے گھر کا حج کرنا۔'' اس شخص نے کہا: ''کیا آپ یہ نہیں سنتے جو اللہ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: ... وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (' ان سے لڑائی کرو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے')۔'' ابن عمرؓ نے کہا:

''ہم نے رسول اللہؐ کی زندگی میں اس پر عمل کیا۔ اس وقت مسلمان کم تعداد میں تھے۔ اور ان پر دین کی وجہ سے ظلم و ستم ہوتا تھا۔ یا تو انکو مار ڈالتے تھے یا سخت سزا دیتے تھے۔ لیکن بعد میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد کافی بڑھ گئی اور کوئی فتنہ نہ رہا۔'' (بخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب 30 تحت سورۃ البقرہ، حدیث 4513)

اس طرح حضرت ابن عمرؓ نے اس لڑائی کو جس کو بعض دوسرے مسلمان جہاد قرار دے رہے تھے قطعی طور پر جہاد ماننے سے انکار کر دیا جس میں جہاد کے طور پر شامل ہونا فرض ہو جائے، اگرچہ یہ لڑائی ایک ایسے خلیفہ کے خلاف تھی جو غاصب تھا اور اس کے خلاف

لڑنے کو جائز سمجھا گیا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے جو اسلام کے پانچ بنیادی ارکان کا حوالہ دیا، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسے نام نہاد جہاد میں شمولیت کو فرض نہیں سمجھتے تھے۔

جنگ کے جہاد کی شرائط

اسلامی اصطلاح میں 'جہاد' تبھی سمجھا جائے گا جب ایسی جنگ ان شرائط کے مطابق ہو جن کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔ ہم باب 4 میں دیکھ چکے ہیں کہ کن حالات میں اسلام جنگ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ یہ جنگ دفاعی جنگ ہونی چاہیے اور اس میں مسلمانوں کے جان ومال کی حفاظت مد نظر ہو جن کو دین کی خاطر ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہو۔ صرف کسی ریاست کی باقاعدہ حکومت یا مسلمانوں کے مسلّم رہنما ہی جہاد کا اعلان کرنے کے مجاز ہیں۔ اگر ممکن ہو تو دشمنوں سے صلح کی بات چیت ہونی چاہیے تاکہ جنگ سے بچا جائے اور امن کو بحال رکھا جائے۔ جنگ کے دوران ان تمام ہدایات کا خاص خیال رکھا جائے جو رسول اکرمؐ نے اس سلسلہ میں دے رکھی ہیں۔ جن میں ان لوگوں کو جو جنگ میں شریک نہیں یا دشمنوں میں ایسے افراد جو کمزور ہیں اور اپنا دفاع نہیں کر سکتے جیسے خواتین، بچے، بوڑھے لوگ اور ایسے لوگ بھی جو محض سپاہیوں کے لئے مزدوروں کا کام کر رہے ہیں اور جنگ میں شریک نہ ہوں، ان کو مارنے سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔

پھر رسول اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ پر پورا پورا عمل کیا جائے کہ قیدیوں سے نہایت عمدہ اور انسانی سلوک کیا جائے اور پھر آخر کار ان کو آزاد کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے لوگوں سے جا ملیں، جیسا کہ قرآن مجید میں حکم ہے:

حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (محمد، 4:47)

”یہاں تک کہ تم ان پر (جنگ میں) غالب آ جاؤ، تو قید میں مضبوط باندھ لو، پھر بعد میں یا تو احسان کے طریق پر یا فدیہ لے کر چھوڑ دو، یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے۔“

اسلام میں اس بات کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں کہ خفیہ انداز میں نام نہاد اسلامی گروہ بنا کر جہاد کا اعلان کر دیا جائے۔ اور پھر ایسے جہاد کے بہانے بلا امتیاز عام لوگوں پر حملے کرنا، انہیں اغوا کرنا یا انہیں یرغمال بنالینا، ایسے سارے طریقے قرآن مجید اور رسول اکرمؐ کی تعلیمات کے بالکل خلاف اور ممنوع ہیں۔

6- شہادت

اسلام کے مطابق شہادت کیا ہے؟

اسلامی لٹریچر میں اللہ کی راہ میں جان دینے والے کو شہید کہا جاتا ہے۔ اس لفظ کے لغوی معنی گواہ کے ہیں اور عام طور پر قرآن مجید میں کسی معاملہ میں گواہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو بھی بار بار قرآن مجید میں شہید کہا گیا ہے، مثلاً:

وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ (اٰلِ عمران، 98:3)

"اور اللہ گواہ (شہید) ہے اس پر جو تم کرتے ہو۔"

فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ (یونس، 29:10)

"سو ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ (شہید) کافی ہے۔"

'شہید' لفظ استعمال کرتے ہوئے، رسول اکرمؐ کو اپنے ماننے والوں کے لئے بطور گواہ کہا گیا ہے اور مسلمانوں کو تمام انسانیت کے لئے گواہ کہا گیا ہے، یعنی پیغامِ حق پہنچانے والے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (البقرہ، 143:2)

"اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک اعلیٰ درجہ کا گروہ بنایا ہے تاکہ تم لوگوں کے پیش رو بنو اور رسول تمہارا پیشرو ہو۔"

ہر ایک نبی کو اپنے پیروکاروں پر گواہ ہونے کے طور پر 'شہید' کہا گیا ہے، جیسا کہ سورۃ النساء، 41:4 میں۔ حضرت عیسیٰ کو سورۃ المائدہ، 117:5 میں اسی طرح 'شہید' کہا گیا ہے۔ یہی لفظ 'شہید' معاہدوں اور سماجی معاملات میں گواہوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، جسکی مثالیں سورۃ البقرہ، 282:2 اور سورۃ النساء، 135:4 میں پائی جاتی ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان دینا شہادت کہلاتا ہے لیکن قرآن مجید میں یہ لفظ صرف کسی چیز یا واقعہ کی گواہی کے لئے استعمال کیا گیا ہے جو نہایت واضح اور دیکھی گئی ہو۔ اسی سلسلہ میں قرآن مجید میں فرمایا: وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ (البقرہ، 283:2) "گواہی کو مت چھپاؤ"۔ ایک اور جگہ فرمایا: فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَآ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا (المائدہ، 107:5) "سو وہ اللہ کی قسم کھالیں کہ ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی سے زیادہ سچی ہے"۔ اور پھر یہ بیان بار بار اللہ تعالیٰ کے بارے میں قرآن مجید میں درج ہے: عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ (الانعام، 73:6، وغیرہ) "وہ غیب اور ظاہر (شہادۃ) کا جاننے والا ہے"۔ گواہی کے معنوں میں یہ لفظ اس مشہور فقرہ یعنی کلمۂ شہادت کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کے اقرار کرنے سے ایک شخص اسلام قبول کرتا ہے۔

یہ الفاظ 'شہید' اور 'شہادت' اللہ کی راہ میں جان دینے والوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں کیونکہ ایسا شخص اپنی زندگی اور موت سے اسلام کی سچائی کی شہادت دیتا ہے۔ لیکن شہید کون ہے؟ جیسا کہ جہاد اور جنگ مترادف نہیں ہیں، اسی طرح ایک مسلمان بغیر کسی جنگ میں شامل ہو کر جان دینے کے بھی شہید ہو سکتا ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے:

"رسول اللہؐ نے اپنے صحابہ سے پوچھا: تم اپنے آپ میں سے کس کو شہید سمجھتے ہو؟ انہوں نے کہا: یارسول اللہ، جو اللہ کی راہ میں مارا جائے وہ شہید ہوتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: تب تو میری امت میں تھوڑے شہید ہونگے۔ انہوں نے پوچھا: یارسول اللہ، پھر وہ کون ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: جو اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے وہ شہید ہے، جو اللہ کی راہ میں مر جائے وہ شہید ہے، جو پلیگ سے مر جائے وہ شہید ہے، جو ہیضہ سے فوت ہو جائے وہ شہید ہے۔" (صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب 51، حدیث 1914)۔

کوئی شخص جو اخلاص کے ساتھ اسلام کی خدمت کرتا ہوا کسی طریق پر وفات پائے وہ شہید ہے۔اسی طرح کوئی شخص جو جنگ میں مارا جائے ضروری نہیں کہ وہ شہید ہو۔ اس کی وضاحت رسول اکرمؐ کی ذیل کی حدیث میں کی گئی ہے:

"لوگوں میں سے سب سے پہلا شخص جس کا قیامت کے دن فیصلہ کیا جائے گا وہ ایک آدمی ہو گا جو شہید ہوا تھا۔ اس کو اللہ کے دربار میں پیش کیا جائے گا۔ اللہ اس کو کہے گا کہ اپنی رحمتوں کو شمار کرو۔ وہ ان کو شمار کرے گا۔ تب اللہ کہے گا: تم نے (انکے لئے) کیا کیا؟ وہ جواب دے گا: میں نے تیری خاطر جنگ کی یہاں تک کہ میں شہید ہو گیا۔ اللہ کہے گا: تم جھوٹ کہتے ہو۔ تم نے اس لئے جنگ کی کہ تمہیں ایک بہادر سپاہی کہا جائے۔ اور تمہیں ایسا ہی کہا گیا۔ تب فیصلہ اس کے خلاف ہو گا اور اس کو منہ کے بل گھسیٹا جائے گا اور دوزخ میں ڈالا جائے گا۔" (صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب 43، حدیث 1905)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگرچہ ایک مسلمان ایک کام کو یہ سمجھ کر کرے کہ اس سے اس کو شہادت نصیب ہو گی لیکن آخرت میں اللہ تعالیٰ اسے سزا کا مستحق گردانے گا کیونکہ اس نے ایک جھوٹا دعویٰ کیا اور اس کے لئے اس کو سزا دی جائے گی۔

ایک شخص نے رسول اکرمؐ سے پوچھا کہ "اگر میں اللہ کی راہ میں مارا جاؤں تو میرے گناہ معاف کر دیے جائیں گے؟" آپؐ نے فرمایا: "ہاں، اگر تو صابر تھا، خلوص نیّت رکھتا تھا، اور دشمن کی طرف منہ کرتا تھا اور کبھی پیٹھ نہیں پھیرتا تھا"۔ پھر آپؐ نے اسے کہا: "تم نے کیا پوچھا تھا؟" اس نے وہی سوال دوہرایا۔ آپؐ نے وہی جواب دوبارہ دے کر اس میں یہ اضافہ کیا: "اگر تجھ پر قرض نہیں تھا، کیونکہ جبریل نے مجھے یہ بتایا ہے" (صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب 32، حدیث 1885)۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کسی کا قرض

ادا کرنا تھا، تو آپؐ نے اسے بتایا کہ اگر وہ جنگ کرنے چلا جائے اور اللہ کی راہ میں مارا جائے، مگر قرض ادا کیے بغیر جو اس پر تھا، تو اسکی یہ کوتاہی معاف نہیں کی جائے گی، یعنی ایک شخص اگر خلوص نیّت سے جنگی جہاد میں شہید ہو، تو پھر بھی اگر اس نے زندگی میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں پہلو تہی کی ہو تو وہ اللہ تعالٰی کے حضور جوابدہ ہو گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں شہادت ایک روحانی مقام ہے جو موت کے بعد عطا کیا جاتا ہے اور کوئی شخص یقینی طور پر نہیں جان سکتا کہ جس کام کو وہ اللہ کی راہ میں سمجھ کر کر رہا ہے، اگر اسے کرتے ہوئے وفات پا جائے تو اللہ تعالٰی یہ مقام اس کو عطا کرے گا۔ مگر جو بات یقینی ہے وہ یہ ہے کہ ایسا مقام کسی ایسے کام کرنے کے نتیجہ میں نہیں مل سکتا جو اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہو، گو مرنے والے کا یہی خیال ہو کہ وہ اسلام کی حمایت میں جہاد کر رہا ہے۔

اس بارے میں مزید یہ وضاحت کرنے کی ضرورت ہے کہ شہید وہی کہلا سکتا ہے جو کسی حملہ آور کے مارنے سے مرے، ایسی وجہ سے جو اس کے بس سے باہر ہو، نہ کہ اس نے اپنے یقینی طور پر مارے جانے کی کاروائی کی ہو۔ ابھی ایک حدیث بیان ہو چکی ہے جس کے مطابق جو شخص ہیضہ یا پلیگ سے فوت ہو جائے اس کو شہیدوں میں شامل کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ایسی بیماری سے مرنے کی خاطر جان بوجھ کر اس میں مبتلا ہونا کہ اس طرح شہادت کا درجہ حاصل ہو جائے، سراسر اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ بلکہ ایک مسلمان کو تو وہ تمام تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جن سے ایسی بیماریوں سے بچاؤ کیا جائے۔ لیکن اگر وہ غیر ارادی طور پر اس بیماری کا شکار ہو جائے اور اسلام کی راہ میں خدمت کرتا ہوا فوت ہو جائے تو اُسے آخرت میں بلند مقام حاصل ہو گا۔

اسی طرح اگر ایک مسلمان جنگ میں مارا جاتا ہے تو اس کے شہید ہونے کی شرائط میں یہ ہے کہ اسکی موت دشمن کے کسی عمل سے ہو، جبکہ وہ دشمن کے حملے کو روک رہا ہو

یا کسی ایسے خارجی عمل کے نتیجہ میں ہو جس سے بچاؤ کرنا اس کے اختیار میں نہ ہو۔

اسلام میں خودکشی گناہ ہے اور اپنی حفاظت کرنا فریضہ ہے

اسلام کی واضح تعلیمات کی رو سے خودکشی ایک نہایت بڑا گناہ ہے۔ اس بارے میں اسلام کی ہدایت یہ ہے:

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (البقرہ، 195:2)

"اور اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔"

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (النساء، 29:4)

"اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔"

احادیث میں رسول اکرم صلعم نے خودکشی کو سختی سے منع فرمایا ہے:

"جو کوئی کسی چیز کے ذریعہ خودکشی کرتا ہے اس کو دوزخ میں اسی چیز کے ذریعہ سزا دی جائیگی۔" (بخاری، کتاب الایمان والنذر، باب 7، حدیث 6652)

صحیح مسلم میں ایک باب ہے جس کا عنوان ہی ہے "جس نے خودکشی کی اس کے لئے نماز جنازہ ترک کرنا" (کتاب الجنائز، باب 38)۔ اس روایت میں درج ہے کہ رسول اکرم صلعم نے خود ایسے فوت شدہ شخص کا جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا جس نے خودکشی کی تھی۔ مسلمان ممالک میں خودکشی کرنے کی کوشش ایک جرم ہے اور اس کا مرتکب قانونی طور پر سزا کا مستحق ہوتا ہے۔

خود کی حفاظت کرنا، یا اپنی جان بچانا، انسان کا بنیادی ترین فطری جذبہ ہے۔ قرآن مجید کی رو سے ایسے اقدام کرنا جن سے اپنی جان بچ جائے، اتنا اہم ہے کہ خاص حالات میں وہ بعض فرائض کو چھوڑ دینے کی اور بعض ممنوعہ چیزوں کے استعمال کی اجازت دیتا ہے، اگر ایسا کرنا جان بچانے کے لئے ناگزیر ہو۔ ہم ذیل میں اس بارے میں اس کی

تفصیل بیان کرتے ہیں:

1- جہاں قرآن مجید بعض چیزوں کے کھانے کو حرام قرار دیتا ہے، جن میں سور کا گوشت بھی شامل ہے، وہاں ان کو کھانے کی اجازت بھی دیتا ہے اگر ان کو کھائے بغیر زندگی کو بچانا، ناممکن ہو جائے۔ ذیل کی دو آیات میں حرام چیزوں کو کھانے سے منع کرنے کے بعد قرآن مجید فرماتا ہے:

فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (المائدہ، 3:5)

"پھر جو شخص بھوک سے مجبور ہو جائے، گناہ کی طرف جھکنے والا نہ ہو، تو اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔"

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝١٤٥ (الانعام، 145:6)

"پھر جو کوئی مجبور ہو جائے، نہ خواہش کرنے والا، نہ حد سے بڑھنے والا، تو تیرا رب بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔"

کہیں بھی قرآن مجید میں ذکر نہیں کہ اگر کوئی مسلمان اپنے اوپر موت وارد کرنے کو ترجیح دے مگر اپنی جان کو بچانے کے لئے ممنوع چیز کا استعمال نہ کرے، تو اس نے اسلام کی خاطر جان دے دی۔

2- ایک مسلمان کو اگر زبردستی اور تشدد کی وجہ سے اپنی جان بچانے کے لئے مسلمان ہونے سے انکار کرنا پڑے، لیکن دل سے وہ مسلمان ہی رہے، تو قرآن مجید اس کو عذابِ الٰہی کا مورد نہیں قرار دیتا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ اس مجبوری کے فعل کی اسے کوئی سزا دے گا:

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾ (النحل، 106:16)

"جو شخص اپنے ایمان کے بعد اللہ کا انکار کرتا ہے مگر وہ نہیں جسے مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو بلکہ وہ جس کا سینہ کفر پر کھل جائے تو ان پر اللہ کی طرف سے غضب ہے اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔"

پس اگر ایک مسلمان کو اسلام کے دشمنوں کی طرف سے یہ دھمکی دی جائے کہ اگر اس نے اسلام سے انکار نہ کیا تو اس کو قتل کر دیا جائیگا، یا کوئی اور خطرناک نتائج بھگتنے پڑینگے، تو قرآن مجید اسکو جان بچانے کے لئے ظاہری طور پر انکار کرنے کی اجازت دیتا ہے اگرچہ خود اپنی رضامندی سے ایسا کرنا ایک بڑا گناہ ہے۔

3-اگر رمضان کے مہینے میں روزہ رکھنے سے کسی مسلمان مرد یا عورت، نوجوان یا عمر رسیدہ کو جان کا خطرہ ہو تو یہ فرض ملتوی کیا جاسکتا ہے۔ اگر ایک شخص باوجود یہ علم رکھتے ہوئے کہ روزہ رکھنے سے اسکو جانی نقصان پہنچ سکتا ہے، روزہ رکھ کر اپنے آپ کو نقصان پہنچائے تو ایسا کرنا اسلام میں کوئی قابل تعریف عمل نہیں ہے۔

4-یہ ایک مسلّمہ بات ہے کہ حج کا فریضہ ادا کرنا ایسے شخص پر فرض نہیں جس کی زندگی اس فرض کی ادائیگی میں کسی وجہ سے خطرہ میں ہو۔

پھر جیسا کہ اس کتابچہ میں پہلے بیان کیا جاچکا ہے جنگ کرنا بھی، جس سے جان کھونے کا خطرہ ہوتا ہے، اسلام نے اسی حالت میں جائز قرار دیا ہے کہ جانیں بچانے کی کوئی اور صورت نہ رہے، اور بغیر جنگ کیے لوگوں کی موت اور بربادی دشمن کے ہاتھوں یقینی امر ہو۔ مثال کے طور پر سورت الحج 39:22 تا 40 کا حوالہ اس کتاب کے باب 4 میں دیا

جاچکا ہے کہ مسلمانوں کو لڑنے کی اجازت دی گئی ہے اگر جنگ ان پر مسلط کی جائے اور ان کے پاس اور کوئی صورت باقی نہ رہے سوائے اس کے کہ وہ دشمن کو واپس دھکیل دیں اور اپنی جانوں اور اپنی عبادت گاہوں کو برباد ہونے سے بچاسکیں۔ دشمن کو طاقت کے ذریعہ واپس دھکیل کر اپنی جانوں کو بچانا خودکشی کرنا نہیں کہلا سکتا۔

شہیدوں کو جنت میں حوروں کا بطور انعام ملنا

یہ غلط خیال اور عقیدہ کہ ایک مسلمان مرد جو شہادت کی موت مرتا ہے اس کو جنت میں 72 کنواری لڑکیاں انعام کے طور پر دی جائینگی، اس نے اسلام کو سخت بدنام کیا ہے اور تمسخر کا نشانہ بنایا ہے اور وہ لوگ جو اسلام کی صحیح تعلیمات سے ناواقف ہیں ان کے لئے یہ بات ہنسی ٹھٹھا اور مذاق کا ذریعہ بن گئی ہے۔ اس کتابچہ میں ہم اسلام میں جنت یا اخروی زندگی کے باغات کے تصور کی تفصیل میں نہیں جاسکتے، بہر حال اس سلسلہ میں ذیل کی تین باتوں کا جاننا ضروری ہے۔

اول۔ اُخروی زندگی کے انعامات مادی نہیں ہوں گے جن سے ہم اس دنیا میں لطف اندوز ہوتے ہیں۔ موت کے بعد کی زندگی ایک ایسی دنیا ہے جس کا تصور انسانی ذہن کا کرنا اس زندگی میں ممکن نہیں۔ انسان اُس دنیا میں ایک بالکل ہی مختلف زندگی گذارے گا جس کا اس زندگی میں معلوم کرنا یا تصور کرنا نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن مجید میں ہے:

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ﴿٦٠﴾ عَلَىٰ أَن نُّبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٦١﴾ (الواقعة، 60:56 تا 61)

”ہم نے تمہارے درمیان موت مقرر کر دی ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں یہ کہ تمہاری مثل بدل کر لائیں۔ اور تمہیں اس صورت میں پیدا کریں جو تم نہیں جانتے۔“

قرآن مجید کے بعض انگریزی تراجم میں اس آیت کے دوسرے حصّہ کا ترجمہ اس طرح ہے، اگر اسکو اردو میں منتقل کیا جائے:

"تمہارے وجود کی فطرت کو بدل دیا جائیگا اور تمہیں ایسے نئے طریق میں وجود کو لایا جائے گا جس کا تم کو ابھی تک علم نہیں" (محمد اسد، Asad)۔

" تمہیں پھر ایسی صورت میں وجود میں لایا جائیگا جس کا تم کو علم نہیں۔" (روڈویل، Rodwell)

"ہم تمہیں ایک دوسری صورت میں پیدا کرینگے اور تمہیں وہ بنائینگے جس کا تمہیں علم نہیں" (پکتھال، Pickthall)۔

جنت میں اُخروی زندگی کی خوشیاں اور لذتیں ایسی ہیں کہ اس دنیا کی زندگی میں ان کی نوعیت کا علم ہی نہیں ہو سکتا، جیسے کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٧﴾ (السجدۃ، 17:32)

"پس کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے لئے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔ اس کا بدلہ جو وہ کرتے تھے۔"

یہی وجہ ہے جنت میں اخروی زندگی کے بیان کو "مثال" کہا گیا ہے، جیسا کے: مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ (الرعد، 35:13 اور محمد، 15:47) یعنی "اس جنت کی مثال جس کا وعدہ متقیوں کو دیا گیا ہے۔"

دوم۔ قرآن مجید میں آٹھ مرتبہ اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ مرد اور عورتیں برابر طریق پر جنتی زندگی کی نعماء سے سرفراز کئے جائیں گے، مثلاً:

1- وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ (النساء، 124:4)

"اور جو نیک کام کرے، خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو۔ تو یہی جنت میں داخل ہونگے۔"

2- وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۷۲﴾ (التوبة، 72:9)

"اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے باغوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، انہیں میں رہیں گے، اور ہمیشگی کے باغوں میں پاکیزہ رہنے کی جگہ کا۔ اور اللہ کی رضا سب سے بڑھ کر (نعمت) ہے۔ یہی بڑی بھاری کامیابی ہے۔"

3- جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ (الرعد، 23:13)

"ہمیشگی کے باغ جن وہ داخل ہونگے اور وہ بھی جو اُن کے ماں باپ، ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے نیک ہوں۔"

4- اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴿۶۹﴾ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ﴿۷۰﴾ (الزخرف، 68:43 تا 71)

"جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے اور فرمانبردار ہیں، تم اور تمہارے ازوج جنت میں داخل ہو جاؤ، خوش رکھے جاؤ گے۔"

5- يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ (الحدید، 12:57)

"جس دن تُو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھے گا، اُن کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں دوڑ رہا ہو گا۔ آج تمہارے لئے خوشخبری ہے۔ باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ انہیں میں رہو گے۔"

پس مومنوں میں خواتین اور مردوں دونوں کو برابر طور پر انعامات اور آسائشیں ملیں گی۔

سوم۔ یہ تمام انعامات، زندگی میں نیک خصلتوں اور کیے ہوئے نیک کاموں کا تمثیلی رنگ میں مظہر ہونگے، جو اخروی زندگی میں ایک مرد یا عورت پر ظاہر کئے جائیں گے۔ مثلاً، جو "نور ان کے آگے اور ان کے دائیں دوڑ رہا ہو گا"، جسکا مندرجہ بالا آیت میں ذکر ہے، وہ اس دنیا کے مادی چراغوں سے نکلنے والی روشنی نہ ہو گی، بلکہ ان کے ایمان کی روشنی ہو گی۔ قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ آتا ہے:

وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ؕ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ِاجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾ (ابراھیم، 14:23 تا 26)

"اور جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے۔ باغوں میں داخل کئے جائینگے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ اپنے رَبّ کے حکم سے انہیں میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان میں ان کی دعائے ملاقات سلام ہو گی۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ نے اچھی بات کی مثال کس طرح بیان کی ہے جیسا کہ ایک پاکیزہ درخت، اس کی جڑ مضبوط ہے اور اس کی شاخیں آسمان میں (پھیلی ہوئی) ہیں۔ وہ اپنے رَبّ کے حکم سے اپنا پھل ہر موسم میں دیتا ہے۔ اور اللہ لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ اور ناپاک بات کی مثال گندے درخت کی طرح ہے جو زمین کے اوپر سے ہی اکھاڑ پھینکا جائے۔ اس کو کچھ بھی قرار نہیں۔"

یہاں اُخروی زندگی کے باغات کا ذکر کرنے کے بعد نیکی کی بات کی مثال ایک اچھے درخت سے دی گئی ہے جس میں ہمیشہ پھل لگتے ہیں۔ اس لئے اخروی زندگی کے باغات وہ نیک اعمال ہیں جو ایک انسان اس زندگی میں کرتا ہے اور وہ اخروی زندگی میں درختوں کی طرح ظاہر ہونگے جن کو پھل لگے گا جس طرح نیک اعمال کو پھل لگتے ہیں۔

اسی طرح اخروی زندگی کی "حسین کنواری عورتیں" وہ اِس زندگی کی عورتیں نہ ہونگی جن سے مرد حضرات جنسی تعلقات رکھیں گے۔ در حقیقت یہ وہ اچھی خوبیاں اور نیک اعمال ہیں جو اس زندگی میں دکھائے گئے، جیسے ایمانداری، کردار کی پاکیزگی، خیرات دینا، عصمت، ذاتی وقار اور ایمان، جن کا اظہار اخروی زندگی میں ان صورتوں میں کیا جائے گا۔ انہی کو اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ یعنی "نیک ساتھی" کہا گیا ہے (دیکھیئے سورۃ البقرہ، 2 :25، آلِ عمران، 15:3، النساء، 57:4) کیونکہ نیک خصلتیں دنیاوی زندگی میں ان کے نیک ساتھی تھیں جو اخروی زندگی میں بشکل انکے ساتھی ظاہر ہونگی۔

سورۃ آلِ عمران کی آیت 15 میں اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ کا حاصل ہونے میں اور اس دنیا

کی عورتوں کو پانے کی خوائش رکھنے میں فرق کیا گیا ہے۔ وہ اس طرح ہے کہ آیت 14 میں اس دنیا کی مادی خواہشات کی دلکشی کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ

"لوگوں کو نفسانی خواہشوں کی محبت بھلی معلوم ہوتی ہے (جیسے) عورتیں اور بیٹے اور ڈھیروں ڈھیر سونا اور چاندی اور پلے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی۔ یہ اس دنیاوی زندگی کا سامان ہے اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔"

اس سے اگلی آیت 15 میں اس کا مقابلہ اخروی زندگی کی نعمات سے کیا گیا ہے:

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾

"کہہ! کیا میں تم کو اس سے اچھی بات بتاؤں! ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، ان کے رَبّ کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ انہی میں رہیں گے، اور پاک ساتھی اور اللہ کی رضامندی ہے اور اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے"۔

ان آیات سے یہ بات نہایت واضح ہے کہ عورتوں سے جنسی خواہشات اور ان جذبات کی ضرورت اس مادی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے ہیں، اور ان سے بہتر اور زیادہ اعلیٰ ہے کہ کوشش کی جائے ان نیک خوبیوں کو حاصل کرنے کی جو اخروی زندگی میں "پاک ساتھیوں" کی شکل میں ہمیں عطا کی جائینگی۔ اس وضاحت سے اس تصوّر کی تردید ہوتی

ہے کہ اس دنیا کی خواہشات مادی رنگ میں انعامات کے طور پر اخروی زندگی میں میسر آئیں گی۔

انٹرنیٹ (Internet) اور دوسرے ذرائع ابلاغ کے ذریعے رسول اکرم صلعم کی ترمذی سے ایک حدیث مشتہر کی گئی ہے، جس کو ٹھٹھا اور مزاح کے رنگ میں پیش کیا جاتا ہے، کہ جنت میں ہر مرد کو 72 "بیویاں" دی جائیں گی۔ (ترمذی، کتاب صفۃ الجنۃ۔ انہی بیویوں کو مذاق اڑانے والے 72 کنواریاں کہتے ہیں۔) لیکن ترمذی کی احادیث میں ہی ذرا آگے چل کر اس کی کتاب الایمان میں حدیث نمبر 9 میں ہے:

اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُوْنَ بَابًا فَاَدْنَاهَا اِمَاطَةُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ وَاَرْفَعُهَا قَوْلُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

"ایمان کے ستر (70) یا اس سے چند زیادہ دروازے ہیں۔ ان میں سے سب سے ادنیٰ سڑک پر سے ایک نقصان دہ چیز کو ہٹانا ہے اور سب سے بلند یہ قول ہے کہ لا الٰہ الا اللہ۔"

ایمان کے ستر یا اس سے چند زیادہ دروازے ہیں، جن میں سے دو کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے، ایک سب سے ادنیٰ اور ایک سب سے بلند۔ ایک اور دروازہ جس کا بعض احادیث میں ذکر ہے وہ حیا ہے۔ یہی وہ ستر (70)، بہتر (72) اوصاف ہیں جو انکے حامل کو اُخروی زندگی میں ازواج کے رنگ میں دیے جائیں گے۔

اُخروی زندگی میں کنواری لڑکیوں کی ایک اور تشریح بھی کی جاسکتی ہے اور اس کی بِنا ذیل کی قرآن مجید کی آیت ہے جس میں ان انعامات کا ذکر ہے جو مومنوں کو وہاں دیئے جائیں گے:

اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ﴿۳۵﴾ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ﴿۳۶﴾ عُرُبًا اَتْرَابًا ﴿۳۷﴾

(الواقعۃ، 35:56 تا 37)

”یقیناً ہم نے انہیں ایک نئی تخلیق میں پیدا کیا ہے۔ پس انہیں کنواریئں بنایا ہے، محبت والیاں، ہم عمر۔“

ان آیات میں ”انہیں“ کی ضمیر دو دفعہ مونث کے صیغہ میں آئی ہے۔ اس کی ایک عام طور پر مانی ہوئی تشریح یہ ہے کہ ان سے مراد مومن عورتیں ہیں۔ انکو اُخروی زندگی میں ایک نئی تخلیق میں اٹھایا جائے گا جو اس کے مطابق ہو گی جس قدر نیک کرداری کا نمونہ انہوں نے دنیاوی زندگی میں عملاً کر کے دکھایا ہو گا۔ انہیں ”کنواری“ کہنے سے مراد ہے کہ انہوں نے اپنی پاکیزگی کو محفوظ رکھا۔ یہ معانی ان آیات کی اس تشریح کے عین مطابق ہے جو ترمذی کی کتاب 'الشمائل المحمدیہ' میں رسول اکرم صلعم سے حسن البصری نے مروی کی ہے:

”ایک بوڑھی عورت رسول اکرم صلعم کے پاس آئی اور کہا یا رسول اللہ! اللہ سے دعا کریں کہ وہ مجھے جنت میں داخل کرے۔ آپؐ نے فرمایا: اے فلاں کی ماں، کوئی بوڑھی عورت جنت میں داخل نہ ہو گی۔ وہ عورت روتے ہوئے چلی گئی۔ تو رسول اکرم صلعم نے فرمایا کہ اس کو کہدو کہ وہ جنت میں ایک بوڑھی عورت کی طرح داخل نہ ہو گی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً، فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا (”یقیناً ہم نے انہیں ایک نئی تخلیق میں پیدا کیا ہے۔ پس انہیں کنواریئں بنایا ہے“)۔ (الشمائل المحمدیہ، از ترمذی، باب رسول اللہؐ کے مذاح، آخری حدیث)

اُخروی زندگی میں ان کو بطور کنواری لڑکیاں اٹھائے جانے سے صرف روحانی تمثیل کے رنگ میں اس پاکیزگی کو بیان کرنا مقصود ہے جس سے انہوں نے دنیا میں زندگی بسر کی

۔دوسری زندگی میں جنسی تعلقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ وہ زندگی جسمانی زندگی نہ ہوگی۔ مذکورہ بالا قرآنی آیت میں "ہم عمر" سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ وہ نیک صفات میں مومن مردوں کی طرح ہوں گی۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کنواری کی اصطلاح بائیبل میں بھی علامتی طور پر استعمال ہوئی ہے۔بنی اسرائیل کو کئی جگہ کنواری کے لفظ سے ذکر کیا گیا ہے، مثال کے طور پر یرمیاہ (Jeremiah) کی کتاب، باب 31، آیت 4اور 21، آموس (Amos) کی کتاب باب 5، آیت 2۔

متی (Matthew) کی انجیل میں عقلمند اور بے وقوف کنواریوں کی تمثیل استعمال کی گئی ہے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ اسلام اس کو یوں بیان فرماتے ہیں:

"اُس وقت آسمان کی بادشاہی ان دس کنواریوں کی مانند ہوگی جو اپنی مشعلیں لے کر دولہا کے استقبال کو نکلیں ۔ان میں پانچ بیوقوف اور پانچ عقلمند تھیں۔" (متی، باب 25، آیات 1 اور 2)۔

ظاہر ہے کہ یہاں کنواری لڑکیوں سے مراد مردوں کی جنسی خواہشات کی تسکین کرنے والی نہیں۔

7- مسلمانوں کا غصّہ اور طیش

اسلام غصّہ پر قابو رکھنے کی تلقین کرتا ہے

آج کل مغرب میں مسلمانوں میں غصّہ کا موضوع، اس بات پر کہ دنیا کے مختلف حصّوں میں انکے مسلمان بھائی تشدد اور بے انصافی کا شکار ہیں، نمایاں طور پر میڈیا میں آرہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس غصّہ اور طیش کی وجہ سے انتہا پسند گروہ اپنی ناراضگی اور بے بسی کا اظہار بے دریغ معصوم جانوں کو مارنے کے ذریعہ کر رہے ہیں۔ اگر اس تشدّد کی وجہ غصّہ کا اظہار ہے تو مسلمانوں کے لئے بے حد ضروری ہے کہ وہ اس بات پر غور کریں کہ جب ایک مسلمان میں غصّہ اور طیش کے جذبات بھڑک اٹھیں تو قرآن مجید اور حدیث کی روشنی میں اسے کیا کرنا چاہیے۔ قرآن مجید نے مسلمانوں کو اس بارے میں ذیل کی تلقین کی ہے:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ (اٰلِ عمران، 133:3 تا 134)

"اور اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جلدی کرو جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ وہ متقیوں کے لئے تیار کی گئی ہے، جو لوگ آسودگی اور تنگی میں خرچ کرتے ہیں اور غصّہ کو دبا لینے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔ اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔"

یہاں الفاظ "غصّہ کو دبا لینے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے" میں لفظ "لوگوں"، جو عربی میں الناس ہے، سے مراد صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ تمام نسلِ

انسانی ہے۔ یہ وہ کردار ہے جو مسلمانوں نے دنیا میں دکھانا ہے اور اس پر عمل کرنا ہے، کہ وہ اپنا غصّہ دبانے والے اور تمام نسلِ انسانی کو معاف کرنے والے ہیں۔

چونکہ ان آیات کے ابتداء میں ہی ہدایت کی گئی ہے کہ اللہ کی مغفرت کی طرف جلدی کرو، اس لئے بعد کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ کی مغفرت حاصل کرنے کے لئے ہمیں دوسروں کے خلاف غصّے پر قابو پانا ہے، انہیں معاف کرنا ہے، بلکہ ان سے نیکی کا سلوک بھی کرنا ہے۔ کیا ہم نے خود ایسے اعمال نہیں کیے جن سے اللہ ناراض ہوا ہو گا؟ تو کیا ہم چاہتے ہیں کہ اللہ اپنا غصّہ ہم پر ظاہر کرے؟ اگر ہم یہ نہیں چاہتے، تو ہمیں بھی ان لوگوں کے خلاف جنہوں نے ہمیں تکلیف پہنچائی ہے غصّے اور طیش کا اظہار نہیں کرنا چاہیے بلکہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

قرآن مجید کی ان آیات میں ہمیں تلقین کی گئی ہے کہ جب لوگوں سے ہمیں تکلیف پہنچے تو ہمارا ردِ عمل تین طریق پر ہو، اور ہمیں حالات کے مطابق ان میں سے جو بھی سب سے بہترین اور موثر طریق ہو، اسکو اختیار کرنا چاہیے۔ غصّہ کے وقت سب سے کم از کم ردِ عمل یہ ہے کہ غصّے پر قابو رکھا جائے۔ غصّے کی حالت میں اگر کوئی عمل اختیار کیا جائے تو اس میں لازماً زیادتی اور ناانصافی کا امکان ہو گا، بلکہ خود مظلوم کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو گا۔ اس لئے ہماری ہر ممکن کوشش ہونی چاہیے کہ رد عمل مناسب ہو اور اس میں سمجھ بوجھ سے کام لیا جائے۔ غصّہ کو دبانے یا اس پر قابو پانے سے بڑھ کر ہم ان لوگوں کو جنہوں نے زیادتی کی ہے انہیں سزا دینے کی بجائے معاف بھی کر سکتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ اس طریق سے زیادتی یا ناانصافی کرنے والوں کو اپنی زیادتی کا احساس ہو جائے اور وہ اپنی اصلاح کر لیں۔ اس سلسلے میں آخری درجہ جو سب سے بلند اور اعلیٰ ہے، جو ان آیات میں بتایا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ برائی کے مقابل نیکی کی جائے۔ لیکن یہاں بھی مقصد یہ ہو کہ برائی کرنے والا اس کے ارتکاب سے آئندہ باز آجائے۔

ان آیات میں اس بات کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ جنت کے حصول کا واحد طریق یہ ہے کہ اپنے غصّہ کو دبایا جائے، اس پر قابو پایا جائے اور دوسروں کو معاف کیا جائے۔

ایک اور مقام پر مومنوں کی نیک خصلتوں کے بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے:

... وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ ... وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ... وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۴۳﴾ (الشوریٰ، 42: 37، 39، 40، 43)

"... اور جب وہ غصّے میں آئیں، تو معاف کر دیتے ہیں ... اور جب ان پر زیادتی ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔ اور بدی کا بدلہ اس کی مثل سزا ہے۔ پھر جو کوئی معاف کرے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ پر ہے ... اور جو کوئی صبر کرے اور معاف کرے تو یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔"

اس میں بھی اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ رد عمل کی صورت قطعاً یہ نہیں ہونی چاہیے کہ طیش کی حالت میں انتقام لیا جائے، چاہے آپ پر کتنی بھی زیادتی کی جائے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کیا جا سکتا ہے کہ برائی کا بدلہ اسی برائی کے مطابق ہو۔ لیکن یہاں بھی معاف کرنے کو تین مرتبہ دہرایا گیا ہے، جو کہ غصّہ کا علاج ہے۔ یہاں جو "اصلاح" کرنے کا ذکر ہے، اس سے مراد دوسرے کی اصلاح کرنے کے علاوہ مصالحت کرنا، معاملات کو درست کرنا، اور صلح صفائی کرنا بھی ہے۔

انصاف کو نفرت پر سبقت ہے

نفرت سے بلند ہو کر انصاف کرنے کے متعلق قرآن مجید مسلمانوں کو نصیحت فرماتا ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا (المائدہ، 2:5)

"اور کسی قوم کی دشمنی کہ انہوں نے تم کو حرمت والی مسجد سے روکا تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم زیادتی کرو۔"

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝٨

(المائدہ، 8:5)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کے لئے کھڑے ہونے والے، انصاف کی گواہی دینے والے ہو جاؤ۔ اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔ اور اللہ کا تقویٰ کرو۔ اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو۔"

دوسری اقوام یا دوسرے لوگوں کے خلاف نفرت اور غصّے کے جذبات کی جائز وجوہات ہو سکتی ہیں جو سمجھ میں آسکتی ہیں۔ انسان کے جذبات اسکے اپنے اختیار میں نہیں ہوتے، لیکن ان آیات میں اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ اس قسم کے جذبات سے مغلوب ہو کر مسلمانوں کو دوسروں کے خلاف زیادتی یا اخلاقی اور قانونی حدود سے تجاوز کر کے کوئی حرکت نہیں کرنی چاہیے۔ نہ صرف یہ کہ ایک مسلمان کسی دوسری قوم سے نفرت کی بنا پر ان سے کوئی برائی نہ کرے، بلکہ اس سے بڑھ کر اسے ان کے ساتھ حق وانصاف کے سلوک کی سختی سے پابندی کرنی چاہیے۔ ان باتوں پر زور دیا گیا ہے کہ وہ تقویٰ میں شامل ہیں جسکا حصول مسلمانوں کا بنیادی فرض ہے اور جیسا کہ آخر میں لکھا ہے، بے انصافی کی غلط حرکتوں سے اللہ باخبر ہو گا۔

حدیث میں غصّہ کے بارے میں ہدایات

حدیث کی تمام مستند کتابوں میں رسول اکرم صلعم کے کثرت سے ایسے قول موجود ہیں جن میں غصّے کی بنا پر کسی عمل کرنے کے خلاف تنبیہہ کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر:

1۔ ”ایک شخص نے نبی کریم صلعم سے عرض کیا :”مجھے کچھ نصیحت فرمائیں“۔ آپ صلعم نے فرمایا: ”غصّہ نہ کیا کر“۔ اس شخص نے یہ بات بار بار پوچھی اور رسول اکرم صلعم یہی جواب دیتے رہے:”غصّہ نہ کیا کر“۔ (بخاری، کتاب الادب، باب 76، حدیث 6116)۔

2۔ ”کوئی حاکم (یعنی جج) دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ نہ دے جبکہ وہ غصّہ کی حالت میں ہو“۔ (بخاری، کتاب الاحکام، باب 13، حدیث 7158)۔

3۔ پہلوان وہ نہیں ہے جو کُشتی میں غالب آئے۔ پہلوان وہ ہے جو اپنے آپ کو غصّہ کے وقت قابو میں رکھے۔“ (مسلم، کتاب البرّ والصلہ والادب، باب ’اسکی فضیلت جو اپنے آپ کو غصّہ کے وقت قابو میں رکھے‘)۔

4۔ ”غصّہ شیطان کی طرف سے ہے اور شیطان کو آگ سے پیدا کیا گیا ہے۔ آگ کو صرف پانی ہی بجھا سکتا ہے۔ پس جب تم میں سے کسی کو غصّہ آئے تو اس کو وضو کر لینا چاہیے۔“ (ابو داؤد، کتاب الادب، باب ’غصّے کے وقت کیا پڑھا جائے‘)۔

5۔ ”جو اپنے غصّے کو روک لیتا ہے، اللہ قیامت کے دن اس سے اپنے عذاب کو روک دے گا“ (مشکوۃ المصابیح، کتاب الادب، باب ’غصّہ اور تکبر‘، تیسری فصل، روایت بحوالہ بیہقی)۔

6۔ جنگ کے بارے میں رسول اکرم صلعم کے مختلف اقوال میں سے ذیل کا ایک قول ہے جسکا غصّہ کے موضوع سے تعلق ہے:

"ایک شخص نبی صلعم کے پاس آیا اور پوچھا: "یا رسول اللہ ! اللہ کی راہ میں جنگ کرنا کیا ہے؟ کیونکہ ہم میں سے کوئی (بعض اوقات) غصّے میں آکر جنگ کرتا ہے اور کوئی تکبّر کی وجہ سے جنگ کرتا ہے"۔... آپؐ نے فرمایا: "جو شخص جنگ کرتا ہے کہ اللہ کا کلام بلند ہو، وہ (جنگ) اللہ کی راہ میں ہے"۔ (بخاری، کتاب العلم، حدیث 123)

پس غصّے یا طیش میں آکر لڑائی کرنا، اللہ کی راہ میں جہاد نہیں ہے۔ یہ بات ذہن نشین کرنی چاہیے کہ اللہ کی راہ میں جنگ کی اجازت صرف دفاع کے لئے دی گئی ہے۔ اس لئے "اللہ کے کلام کو بلند" کرنے کی جنگ وہ ہے جو حملہ آور دشمن کو پسپا کرنے کے لئے ہو، جس دشمن کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کو تباہ کرنا ہو۔ اور اس طرح اس دشمن کے مقاصد اور کوششوں کو ناکام کرکے تو اسلام کو غالب کرنا۔

8- جنگ بائیبل کی روشنی میں

گذشتہ ابواب میں اسلامی تعلیمات کی وضاحت کی گئی ہے تا کہ اسلام کے خلاف خاص قسم کے اعتراضات اور غلط بیانات اور خلاف واقعہ باتوں کی تصحیح کی جائے۔ یہاں اب بائیبل سے جنگ کے متعلق بعض حوالوں کا ذکر کیا جائے گا کیونکہ اسلام کے مغربی ناقدین جو جنگ کے متعلق اسلام پر اعتراض کرتے ہیں، ان میں سے اکثر بائیبل کو اپنا نازل شدہ صحیفہ مانتے ہیں۔ اور وہ جو اسے بطور خدا کی کتاب تسلیم نہیں کرتے وہ بھی مانتے ہیں کہ بائیبل کو مغربی تہذیب میں وہ اہم کردار حاصل ہے جو کسی اور کتاب کو حاصل نہیں۔

بائیبل میں "جنگجو خُدا"

حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل یہ حمد گاتے رہے:

"میں خُداوند کی ثنا گاؤں گا کیونکہ وہ جلال کے ساتھ فتحمند ہوا... خُداوند میرا زور اور راگ ہے... خُداوند جنگجو ہے۔ یہوواہ اس کا نام ہے۔" (خروج، Exodus، باب 15، آیات 1 تا 3)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگجو ہونا خُدا کی بڑی صفات میں سے ہے کیونکہ اس صفت کے ذکر کے ساتھ ہی خدا کا نام آتا ہے۔ اگر قرآن میں کوئی ایسے الفاظ موجود ہوتے جو خُدا کو بطور جنگجو کے پیش کرتے تو ہمارے معترضین ان الفاظ کو دہراتے نہ تھکتے۔

پھر بائیبل میں اس وعدے کو بار بار بیان کیا گیا ہے کہ خدا اس کے ماننے والوں کے لئے جنگ میں لڑتا ہے:

"تم ان سے نہ ڈرنا کیونکہ خُداوند تمہارا خُدا تمہارے لئے لڑتا ہے۔" (استثناء، Deuteronomy، باب 3، آیت 22)

"سنو اے بنی اسرائیلیو! تم آج کے دن اپنے دشمنوں کے مقابلہ کے لئے معرکہ جنگ میں آئے ہو۔ سو تمہارا دل ہراساں نہ ہو۔ تم نہ خوف کرو نہ کانپو۔ نہ ان سے دہشت کھاؤ۔ کیوں کہ خُداوند تمہارا خُدا تمہارے ساتھ ساتھ چلتا ہے تاکہ تم کو بچانے کو تمہاری طرف سے تمہارے دشمنوں سے جنگ کرے۔" (استثناء، باب 20، آیات 3 تا 4)

"تمہارا ایک ایک مرد ایک ایک ہزار کو رگیدیگا کیونکہ خُداوند تمہارا خُدا ہی تمہارے لئے لڑتا ہے جیسا اس نے تم سے کہا۔" (یشوع، Joshua، باب 23، آیت 10)

بائیبل میں جنگ کے متعلق قانون

بائیبل کے مطابق بنی اسرائیل کو خدا نے مغلوب شدہ دشمن سے سلوک کرنے کے متعلق مندرجہ ذیل کے احکام دیئے:

"جب تُو کسی شہر سے جنگ کرنے کو اس کے نزدیک پہنچے تو پہلے اسے صلح کا پیغام دینا۔ اور اگر وہ تجھ کو صلح کا جواب دے اور اپنے پھاٹک تیرے لئے کھول دے تو وہاں کے سب باشندے تیرے باج گذار بن کر تیری خدمت کریں۔ اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ تجھ سے لڑنا چاہے تو تُو اس کا محاصرہ کرنا۔ اور جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں کر دے تو وہاں کے ہر مرد کو تلوار سے قتل کر ڈالنا۔ لیکن عورتوں اور بال بچوں اور چوپایوں اور اس شہر کے سب مال اور لوٹ کو اپنے لئے رکھ لینا اور تو اپنے دشمنوں کی اس لوٹ کو جو خُداوند تیرے خُدا نے تجھ کو دی ہو کھانا۔ ان سب شہروں کا یہی حال کرنا جو تجھ سے بہت دور ہیں اور ان قوموں کے شہر نہیں ہیں۔ پر ان قوموں کے شہروں میں جن کو خُداوند تیرا خُدا میراث کے طور پر تجھ کو دیتا ہے کسی ذی

نفس کو جیتا نہ بچا رکھنا۔ بلکہ تو ان کو یعنی حتّی (Hittite) اور اموری (Amorite) اور کنعانی (Canaanite) اور فرزّی (Perizzite) اور حوّی (Hivite) اور یبوسی (Jebusite) قوموں کو جیسا خُداوند تیرے خُدا نے تجھ کو حکم دیا ہے بالکل نیست کر دینا۔" (استثناء، باب 20، آیات 10 تا 17)

بائیبل کے انگریزی ترجمہ میں "ذی نفس" کی بجائے "جو کوئی سانس لیتا ہو" لکھا ہے۔ مندرجہ بالا حوالہ کے مطابق "جو شہر تجھ سے بہت دور ہیں" اگر ان میں سے کوئی شہر صلح قبول نہ کرے بلکہ لڑائی کرے، تو اس کی شکست کے بعد اس کے تمام مردوں کو قتل کر دینا چاہیے اور ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنالینا چاہیے۔ لیکن ان شہروں کو جو وراثت کے طور پر خدا دے، ان کے لئے سزا اس سے بھی سخت ہے اور ہر کوئی جو "سانس لیتا ہو" اس کو مار دینا چاہیے۔

بائیبل میں جنگ میں طریق کار کی مثالیں اور واقعات

مدیانیوں کے خلاف بنی اسرائیل کی جنگ کی تفصیل اس طرح دی گئی ہے:

"تب موسیٰ نے لوگوں سے کہا: اپنے میں سے جنگ کے لئے آدمیوں کو مسلح کرو تا کہ وہ مدیانیوں (Midianites) پر حملہ کریں اور مدیانیوں سے خُداوند کا انتقام لیں۔ . . اور جیسا خُداوند نے موسیٰ کو حکم دیا تھا اس کے مطابق انہوں نے مدیانیوں سے جنگ کی اور سب مردوں کو قتل کیا۔ . . اور بنی اسرائیل نے مدیان کی عورتوں اور ان کے بچوں کو اسیر کیا اور ان کے چوپائے اور بھیڑ بکریاں اور مال واسباب سب کچھ لوٹ لیا۔ اور ان کی سکونت گاہوں کے سب شہروں کو جن میں وہ رہتے تھے اور ان کی سب چھاؤنیوں کو آگ سے پھونک دیا۔ اور انہوں نے سارا مالِ غنیمت اور سب اسیر، کیا انسان اور کیا حیوان، ساتھ لیے۔" (گنتی، Numbers، باب 31، آیات 3، 7، 9، 10، اور 11)

لیکن جب وہ قیدیوں اور لوٹ مار کے مال کو واپس لائے تو حضرت موسیٰؑ ان سے ناخوش ہوئے کہ انہوں نے عورتوں اور بچوں کو زندہ رہنے دیا:

"اور موسیٰ ان فوجی سرداروں پر جو ہزاروں اور سینکڑوں کے سردار تھے اور جنگ سے لوٹے تھے جھلایا، اور ان سے کہنے لگا: کیا تم نے سب عورتیں جیتی بچا رکھی ہیں؟... اس لئے ان بچوں میں جتنے لڑکے ہیں سب کو مار ڈالو اور جتنی عورتیں مرد کا منہ دیکھ چکی ہیں (یعنی وہ عورتیں جو کنواری نہیں) ان کو قتل کر ڈالو۔ لیکن ان لڑکیوں کو جو مرد سے واقف نہیں اور اچھوتی ہیں اپنے لئے زندہ رکھو۔" (گنتی، باب 31، آیات 14، 15، 17، 18)

یشوع (Joshua) کی انجیل نے کئی ایسے واقعات درج کیے ہیں جن میں اس معروف جرنیل کی سرکردگی میں بنی اسرائیل کی فوج نے مختلف شہروں کے تمام رہنے والوں کو قتل کر دیا جن پر وہ قابض ہوا۔ جریکو کی دیواروں (walls of Jericho) کے گر جانے کے مشہور واقعہ کے بعد یشوع کی فوج نے مندرجہ ذیل اقدامات کیے:

"اور انہوں نے ان سب کو جو شہر میں تھے، کیا مرد اور کیا عورت، کیا جوان اور کیا بڈھے، کیا بیل کیا بھیڑ اور کیا گدھے، سب کو تلوار کی دھار سے نیست کر دیا" (یشوع، باب 6، آیت 21)

جریکو کے بعد عی (Ai) کا ذکر یوں بیان ہوا ہے:

"اور جب اسرائیلی عی (Ai) کے سب باشندوں کو میدان میں اس بیابان کے درمیان جہاں انہوں نے ان کا پیچھا کیا تھا قتل کر چکے اور وہ سب تلوار سے مارے گئے یہاں تک کہ بالکل فنا ہو گئے۔ تو سب بنی اسرائیل عی کو پھرے اور اسے تہ تیغ کر دیا۔ چنانچہ وہ جو اس دن مارے گئے مرد اور عورت ملا کر بارہ ہزار یعنی عی کے سب لوگ تھے۔ کیونکہ یشوع نے اپنا ہاتھ جس سے وہ برچھے کو

بڑھائے ہوئے تھا نہیں کھینچا جب تک کہ اس نے عی کے سب رہنے والوں کو بالکل ہلاک نہ کر ڈالا۔ اور اسرائیلیوں نے، خداوند کے حکم کے مطابق جو اس نے یشوع کو دیا تھا، اپنے لئے فقط شہر کے چوپایوں اور مالِ غنیمت کو لوٹ میں لیا۔ پس یشوع نے عی جلا کر ہمیشہ کے لئے اسے ایک ڈھیر اور ویرانا بنا دیا جو آج کے دن تک ہے"۔ (یشوع، باب 8، آیات 24 تا 28)

یشوع باب 10، آیات 28 تا 39 میں ان سات شہروں کی فہرست دی گئی ہے جو یشوع نے ایک ایک کر کے فتح کیے، اور ان میں سے ہر ایک شہر کو جس بری طرح برباد کیا گیا ان کے لئے تقریباً ذیل کے الفاظ ہی استعمال ہوئے: "اُس کے سب لوگوں کو بالکُل ہلاک کر ڈالا اور ایک کو بھی باقی نہ چھوڑا" (آیت 28) اور "سب لوگوں کو جو اُس میں تھے بالکُل ہلاک کر دِیا۔ اُس نے ایک کو بھی باقی نہ چھوڑا" (آیت 39)۔ آخر میں یہ بیان کیا گیا ہے:

"سو یشوع نے ... ایک کو بھی جیتا نہ چھوڑا بلکہ وہاں کے ہر متنفس کو جیسا خداوند اسرائیل نے حکم کیا تھا بالکل ہلاک کر ڈالا۔" (آیت 40)

یشوع باب 11 میں دیگر شہروں کے متعلق یہ لکھا گیا ہے:

"اور ان شہروں کے تمام مال غنیمت اور چوپایوں کو بنی اسرائیل نے اپنے واسطے لوٹ میں لے لیا لیکن ہر ایک آدمی کو تلوار کی دھار سے قتل کیا۔ یہاں تک کہ ان کو نابود کر دیا اور ایک متنفس کو بھی باقی نہ چھوڑا۔ جیسا خداوند نے اپنے بندے موسیٰ کو حکم دیا تھا ویسا ہی موسیٰ نے یشوع کو حکم دیا اور یشوع نے ویسا ہی کیا اور جو جو حکم خداوند نے موسیٰ کو دیا تھا ان میں سے کسی کو اُس نے بغیر پورا کیے نہ چھوڑا۔" (یشوع، باب 11، آیات 14، 15)

اس تمام قتلوں کے متعلق لکھا ہے کہ یہ خدا کے حکم سے کیے گئے۔

نبی سمیوئل (Samuel) نے ساؤل (Saul) سے کہا، جسے اس نے اسرائیل کا بادشاہ مقرر کیا گیا تھا:

"اور سموئیل نے ساؤل سے کہا کہ خداوند نے مجھے بھیجا ہے کہ میں تجھے مسح کروں تا کہ تو اس کی قوم اسرائیل کا بادشاہ ہو۔ سو اب تو خداوند کی باتیں سن ... سو اب تُو جا اور عمالیق (Amalek) کو مار اور جو کچھ ان کا ہے سب کو بالکل نابود کر دے اور ان پر رحم مت کر بلکہ مرد اور عورت، ننھے بچے اور شیر خوار، گائے بیل اور بھیڑ بکریاں، اونٹ اور گدھے سب کو قتل کر ڈال۔"
(1 سموئیل، باب 15، آیات 1 اور 3)

حضرت داؤدؑ، جو بادشاہ بھی تھے، ان کے متعلق یہ لکھا گیا ہے:

"اور داؤد نے اس سرزمین کو تباہ کر ڈالا اور عورت مرد کسی کو جیتا نہیں چھوڑا اور ان کی بھیڑ بکریاں اور بیل اور گدھے اور اونٹ اور کپڑے لے کر لوٹا۔"
(1 سموئیل، باب 27، آیت 9)

حضرت عیسیٰؑ کے امن کے متعلق بیانات

حیرانگی کی بات ہے کہ حضرت عیسیٰؑ، جن کی تعلیم انتہائی امن پسند سمجھی جاتی ہے، انہوں نے بھی یہ فرمایا:

"یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں۔" (متی، Matthew، باب 10، آیت 34)

"میں زمین پر آگ بھڑکانے آیا ہوں اور اگر لگ چکی ہے تو میں کیا ہی خوش ہوتا! ... کیا تم گمان کرتے ہو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں؟ میں تم

سے کہتا ہوں کہ نہیں بلکہ جدائی کرانے۔" (لوقا، Luke، باب 12، آیات 49، 51)

اس میں شک نہیں کہ ان باتوں کی مختلف تاویل بھی کی جاسکتی ہے بجائے اس کے کہ ان کو جنگ کی دھمکی سمجھا جائے۔ لیکن اگر یہ الفاظ قرآن مجید میں ہوتے تو اسلام کے معترضین غالب امکان ہے ان کو پکڑ لیتے اور بطور ثبوت پیش کرتے کہ اسلام امن و صلح کی نہیں بلکہ جنگ کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

سمسُون (Samson) کی کہانی کی 11 ستمبر 2001 کے واقعہ سے مماثلت

سمسُون کی کہانی، جو بنی اسرائیل کا ایک انتہائی طاقتور ہیرو تھا، بائیبل میں کتاب 'قضاۃ' (Judges) کے ابواب 13 تا 16 میں درج ہے اور بہت مشہور ہے۔ اسکی شہرت امریکن فلم 'سَیم سَن اینڈ ڈیلائیلا' (Samson and Delilah) کی وجہ سے بڑھ گئی، جو 1949ء میں نکلی اور کئی مختلف فلمی ایوارڈ حاصل کیے۔

بائیبل کے مطابق سمسُون نے فلستیوں (Philistines)، جو کہ اسرائیلیوں کے مخالف تھے، ان کے مقابلہ میں کئی حیران کن قوت کے کام دکھائے جبکہ "خُداوند کی روح اس پر زور سے نازل ہوئی" (قضاۃ، باب 14، آیات 6، 19 اور باب 15، آیت 14)۔ یعنی سمسُون طاقت کا یہ سب مظاہرہ خُدا کی مدد اور اس کی نازل کردہ قوت کی وجہ سے کر رہا تھا۔ آخر کار اس کو فلستیوں نے پکڑ لیا۔ انہوں نے اس کو اندھا کر دیا اور قید کر دیا اور لوگوں کو خوش کرنے کے لئے اس سے تماشے کرواتے تھے۔ سمسُون کی کہانی کا آخر اس طرح پر بیان ہوا ہے:

"اور فلستیوں کے سردار اکھٹے ہوئے تاکہ اپنے دیوتا دجون کے لئے بڑی قربانی گذاریں اور خوشی کریں کیونکہ وہ کہتے تھے کہ ہمارے دیوتا نے ہمارے

دشمن سمسُون کو ہمارے ہاتھ میں کر دیا ہے۔ اور جب لوگ اس کو دیکھتے تو اپنے دیوتا کی تعریف کرتے اور کہتے تھے کہ ہمارے دیوتا نے ہمارے دشمن اور ہمارے ملک کو اجاڑنے والے کو جس نے ہم میں سے بہتوں کو ہلاک کیا، ہمارے ہاتھ میں کر دیا ہے۔ اور ایسا ہوا کہ جب ان کے دل نہایت شاد ہوئے تو وہ کہنے لگے کہ سمسُون کو بلاؤ کہ ہمارے لئے کوئی کھیل کرے۔ سو انہوں نے سمسُون کو قید خانہ سے بلوایا اور وہ ان کے لئے کھیل کرنے لگا اور انہوں نے اس کو دو ستونوں کے بیچ کھڑا کیا۔ تب سمسُون نے اس لڑکے سے جو اس کا ہاتھ پکڑے تھا کہا مجھے ان ستونوں کو جن پر یہ گھر قائم ہے تھامنے دے تا کہ میں ان پر ٹیک لگاؤں۔ اور وہ گھر مردوں اور عورتوں سے بھرا تھا اور فلستیوں کے سب سردار وہیں تھے اور چھت پر تقریباً تین ہزار مرد وزن تھے، جو سمسُون کے کھیل دیکھ رہے تھے۔ تب سمسُون نے خُداوند سے فریاد کی اور کہا: ”اے مالک خُداوند! میں تیری منت کرتا ہوں کہ مجھے یاد کر اور میں تیری منّت کرتا ہوں۔ اے خُدا فقط اس دفعہ اور تُو مجھے زور بخش تا کہ میں یکبار گی فلستیوں سے اپنی دونوں آنکھوں کا بدلہ لوں“۔ اور سمسُون نے دونوں درمیانی ستونوں کو جن پر گھر قائم تھا پکڑ کر ایک پر داہنے ہاتھ اور دوسرے پر بائیں سے زور لگایا۔ اور سمسُون کہنے لگا: ”فلستیوں کے ساتھ مجھے بھی مرنا ہی ہے“۔ سو وہ اپنے سارے زور سے جھکا اور وہ گھر ان سرداروں اور سب لوگوں پر جو اس میں تھے گر پڑا۔ پس وہ مردے جن کو اس نے اپنے مرتے دم مارا ان سے بھی زیادہ تھے جن کو اس نے جیتے جی قتل کیا۔“ (قضاۃ، Judges، باب 16، آیات 23 تا 30)

یہ واقعہ آج کل کے خود کش حملوں سے مماثلت رکھتا ہے، خاص طور پر اس سخت تباہی کے جو 11 ستمبر 2001ء کو امریکہ کے شہر نیویارک میں ٹون ٹاورز کے گرنے سے ہوئی۔ سمسُون نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ایک اونچی عمارت کو گرادیا تاکہ تمام لوگوں کو اس کے نیچے پیس کر مار ڈالے جو اس میں موجود تھے یا اس کے اردگرد کھڑے تھے، یہ جانتے ہوئے کہ وہ ایسا کرنے سے ان کے ساتھ خود بھی موت سے ہمکنار ہو گا۔ اس نے یہ کام خدا کا نام لے کر کیا، یہ یقین رکھتے ہوئے کہ خدا اس کو ایسا کرنے کی قوت دے رہا ہے۔ حتیٰ کہ اس میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد بھی تقریباً 3000 تھی اور 11 ستمبر 2001ء کو بھی تقریباً 3000 لوگ اس واقعہ میں مارے گئے۔ اور اگر دیکھا جائے تو سمسُون کے زمانے میں وہاں کی تھوڑی آبادی کے لحاظ سے مرنے والوں کی تعداد موجودہ زمانہ سے نسبتاً بہت زیادہ تھی۔

اگر آج اسی قسم کی حرکت کچھ بے راہ مسلمان کرتے ہیں، اور وہ بھی کسی اور مذہب کی عبادت گاہ کے متعلق، تو اس کی سخت مذمت کی جائے گی، جو کہ کرنا بالکل درست اور جائز ہو گا۔ یقیناً یہ ایک غیر اسلامی اور غیر انسانی فعل ہو گا۔ لیکن دوسری طرف سمسُون بائیبل کا ہیرو ہے، وہ بائیبل کی کتاب قضاۃ کا ایک قاضی ہے، اور اس کی کہانی کے پر مغرب میں لاکھوں فلم ناظرین نے اسکے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور اس کے کارنامہ کو سراہا اور اس فلم کو بڑے بڑے فلمی ایوارڈ ملے۔

اس باب کا مقصد یہ نہیں کہ بائیبل کی باتوں یا تعلیمات کو غلط رنگ میں پیش کیا جائے جو یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک خدا کی نازل شدہ کتاب ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم اسلام کے ناقدین کو یہ سوچنے کی دعوت دیں کہ وہ اپنی مذہبی روایات پر بھی غور کیا کریں جب وہ اسلام کے خلاف ایسے مواد ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں جس سے وہ لوگوں کو تاثر دیں کہ اسلام ظلمانہ جنگ اور تشدد کی تعلیم دیتا ہے۔

9- مسلمانوں کے غیر مسلمانوں سے تعلقات کی نوعیت

اسلامی تعلیمات مسلمانوں کو غیر مذاہب کے لوگوں سے امن وسکون سے رہنے سہنے کے سلسلہ میں تین پہلوؤں سے رہنمائی فراہم کرتی ہیں : فلسفیانہ، قانونی اور اخلاقی، خواہ وہ مسلمان افراد یا گروہ ہوں جو کسی غیر مسلم یا مسلمان ملک میں رہتے ہیں، یا مسلمان ممالک ہوں جنکا واسطہ اس دنیا کے غیر مسلم ممالک سے پڑتا ہے۔

فلسفیانہ بنیاد

فلسفیانہ یا نظریاتی نقطہ نظر سے قرآن مجید ابتدا میں ہی پہلی سورت، سورۃ الفاتحہ، کے شروع میں ہی اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ یعنی اللہ تمام عالموں کا رب ہے۔ لفظ ''رَبّ'' اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ اللہ ایسی ہستی ہے جو بلا امتیاز قومیت اور مذہب کے انسان کی نشو ونما اور اس کی ترقی کے لئے جو کچھ بھی ضروری ہے وہ مہیا کرتا ہے۔ اللہ کسی ایک قوم، ایک نسل یا مذہب کے ماننے والوں کا رَبّ نہیں۔ جس طرح وہ تمام انسانوں کی جسمانی نشو نما اور ترقی کے سامان مہیا کرتا ہے، اس طرح ہی، اسلام کے مطابق، اللہ تعالیٰ نے تمام قوموں اور نسلوں میں بلا امتیاز قومیت اور مذہب ان کی ہدایت کے لئے اپنے نبی اور رسول مبعوث کئے۔ اللہ تعالیٰ جس طرح مسلمانوں کا رَبّ ہے تو بالکل اسی طرح وہ ایک غیر مسلم کا بلکہ مسلمانوں کے دشمنوں کا بھی رَبّ ہے۔

قرآن مجید کی پہلی سورت الفاتحہ کی طرح اسکی آخری سورت الناس بھی، جس کی چھ آیات ہیں، ایک مختصر دعا ہے جو اس طرح شروع ہوتی ہے:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾ مَلِكِ النَّاسِ ۙ﴿۲﴾ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ﴿۳﴾

"کہہ! میں پناہ مانگتا ہوں لوگوں (یعنی تمام انسانوں) کے رَبّ کی، لوگوں کے بادشاہ کی، لوگوں کے معبود کی"۔

مزید براں تمام انسانوں کو براہ راست خطاب کرتے ہوئے قرآن مجید انہیں کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پوری انسانیت کو بطور ایک ہی قوم کے تخلیق کیا ہے، ایک ہی ماخذ سے، تاکہ وہ ایک ہی گھر میں زندگی گذاریں، اسی فرش پر جو اِن سب کے پیروں تلے ہے، یعنی یہ زمین، اور اسی ایک آسمان کے نیچے۔ قرآن مجید کے الفاظ یہ ہیں:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿٢١﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۖ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ (البقرہ، 2:21، 22)

"اے لوگو! اپنے رَبّ کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور انہیں جو تم سے پہلے تھے، تاکہ تم متقی ہو جاؤ۔ وہ جس نے زمین کو تمہارے لئے فرش بنایا اور آسمان کو عمارت۔ اور اوپر سے پانی اتارا پھر اس کے ساتھ تمہارے لئے پھلوں سے رزق نکالا۔"

یعنی، تمام انسان بلا امتیاز اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور اسی طرح ان کے آباو اجداد بھی تھے۔ اور یہ تمام مخلوق اسی زمین پر زندگی گزارتے، اور اسی ہوا سے سانس لیتے، اور زمین کے انہی وسائل کو استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے انسان کو اسی خالق کی عبادت کرنی چاہیے، نہ کہ ایک قوم کسی دوسری قوم کی عبودیّت یا غلامی اختیار کرے۔ اسی طرح قرآن مجید ایک دوسری جگہ صرف ایمان لانے والوں کو ہی نہیں بلکہ تمام انسانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ (النساء، 1:4)

"اے لوگو! اپنے رَبّ کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائے۔ اور نگہداشت کرو اللہ (کے حقوق) کی، جس کے ذریعہ تم ایک دوسرے سے (اپنے حقوق کے) سوال کرتے ہو، اور رَحموں کی بھی (یعنی انسانی رشتوں کی)"۔

اس جگہ ضروری نہیں کہ یہ معنی ہو کہ انسان کا اول جوڑا حضرت آدم اور حوا تھے، جن سے ساری نسل انسانیت وجود میں آئی۔ یہاں واضح مطلب یہ ہے کہ مرد اور عورتیں ایک ہی اصل سے ہیں، اور ایک مرد اور عورت کے جوڑے سے انسان پیدا ہوتے ہیں اور پوری انسانیت وجود میں آتی ہے۔ اس آیت کے آخر میں باہمی خونی رشتہ، یعنی "رَحموں" کی نگہداشت کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ یہ صرف کسی خاندان، قبیلہ یا قوم کے باہمی تعلقات کے ذکر تک محدود نہیں بلکہ واضح طور پر اس میں اشارہ پوری انسانیت کی طرف ہے کیونکہ اس بات کا اس آیت کے شروع میں ہی ذکر ہے کہ پوری انسانیت ایک ہی اصل سے وجود میں آتی ہے، یعنی ایک انسان کا رشتہ ہر دوسرے انسان سے ہے۔ اس لئے تمام انسانیت کے لئے رحمدلی اور خوشگوار تعلقات کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔

تمام انسانیت کو قرآن مجید میں واضح الفاظ میں ایک ہی امّت کہا گیا ہے:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ (البقرہ، 213:2)

"سب انسان ایک ہی امّت ہیں۔ پس اللہ نے نبیوں کو بھیجا، خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے اور ان کے ساتھ حق کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ لوگوں میں ان باتوں کا فیصلہ کرے جن میں وہ باہم اختلاف کرتے تھے۔"

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ (یونس، 19:10)

"اور سب انسان ہیں مگر ایک ہی امّت، سو وہ اختلاف کرتے ہیں۔"

یعنی پوری انسانیت ایک قوم کا حکم رکھتی ہے جس کے افراد سوچ، مذہب اور رواج میں ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں۔ مگر اس اختلاف کو نقصان کا ذریعہ بنانے کی بجائے زیادہ مفید طریق سے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس بارے میں قرآن مجید کا ارشاد یہ ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۙ﴿۴۸﴾ (المائدہ، 48:5)

"ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور طریق مقرر کیا اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک ہی گروہ (دینی امّت) بنا دیتا۔ لیکن (وہ چاہتا ہے) کہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہارے جوہر پرکھے۔ سو نیکیوں کو آگے بڑھ کر لو۔ تم سب کو اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ پس جن باتوں میں تم اختلاف کرتے تھے وہ تمہیں بتادے گا۔"

یہاں اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ تمام مذاہب نے نیک اعمال کو بجالانے کی تبلیغ کی، اس لئے انکے ماننے والوں کو نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جب تک انسان دنیا میں ہونگے ان میں عقاید اور نظریات میں ہمیشہ

اختلاف رہیگا۔ موت کے بعد ہی پتہ چلے گا کہ کون صحیح راستہ پر تھا اور کون غلط راہ پر تھا۔ مذاہب کو آپس میں جھگڑنے کی کوئی ضرورت نہیں، اسکے برعکس مسلمانوں کو دوسروں تک ذیل کا پیغام پہنچانا ہے:

اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ؕ لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾

(الشوریٰ، 42: 15)

"اللہ ہمارا رَبّ ہے اور تمہارا رَبّ ہے۔ ہمارے لئے ہمارے عمل ہیں اور تمہارے لئے تمہارے عمل۔ ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں۔ اللہ ہمیں جمع کرے گا اور اسی کی طرف انجام کار پھر کر آنا ہے۔"

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ (البقرہ، 2: 139)

"کیا تم ہمارے سے جھگڑتے ہو اللہ کے بارے میں، اور وہ ہمارا رَبّ ہے اور تمہارا رَبّ ہے۔ اور ہمارے لئے ہمارے عمل ہیں اور تمہارے لئے تمہارے عمل۔ اور ہم اسکی طرف مخلص ہیں۔"

یعنی اللہ تعالیٰ کا معیارِ انصاف ہمارے لئے اور تمہارے لئے ایک ہی ہے کیونکہ وہ ہمارا بھی رَبّ ہے اور تمہارا بھی رَبّ ہے، اور اسی معیار کے مطابق وہ ہمارے اور تمہارے اعمال کا فیصلہ کرے گا۔ آپس میں جھگڑنے کی بجائے اپنے اعمال کو بہتر بناؤ۔

قرآن مجید یہ بھی تعلیم دیتا ہے کہ تمام انسانوں کی فطرت ایک جیسی ہے اور اس فطرت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی، جیسا کہ قرآن میں ہے:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ

(الروم، 30:30)

"وہ فطرت جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی تخلیق کو کوئی بدل نہیں سکتا۔"

قوموں اور لوگوں کا رنگ، زبان وغیرہ میں مختلف ہونا اس بات کی نشاندہی نہیں کرتا کہ کون برتر اور اعلیٰ ہے اور کون کمتر اور حقیر، بلکہ یہ حقائق ہیں جن کے مشاہدہ اور مطالعہ سے انسان کے علم میں، اور دوسروں کے متعلق معلومات میں، اضافہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں مذکور ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ﴿۲۲﴾ (الروم، 22:30)

"اور اللہ کے نشانوں میں سے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقینا اس میں علم والوں کے لئے نشان ہیں۔"

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَاۗىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ (الحجرٰت، 13:49)

"اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہاری شاخیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو (یعنی ان کے متعلق معلومات حاصل کرو)۔ تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے شریف وہ ہے جو سب سے پرہیز گار ہے۔"

پس قرآن مجید کی تعلیمات ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام انسانیت کا رَبّ اور پیدا کرنے والا ہے، تمام دنیا کے لوگ ایک ہی قوم کی حیثیت رکھتے ہیں، تمام اقوام میں اللہ کے رسول

مبعوث ہوئے، اور مسلمانوں کو ان تمام رسولوں پر ایمان لانا چاہیے جس طرح وہ رسول اکرم صلعم پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ تعلیمات مسلمانوں کو ایک فلسفیانہ اور نظریاتی بنیاد مہیا کرتی ہیں جس پر قائم ہو کر مسلمان دنیا کے تمام دوسرے لوگوں کے ساتھ امن، دوستی اور رواداری سے رہ سکتے ہیں۔

اب ہم قرآن مجید کی ان تعلیمات کے عملی اثرات رسول اکرم صلعم کی زندگی سے چند مثالوں کے ذریعے پیش کرتے ہیں:

"ایک جنازہ ہمارے سامنے سے گزرا تو نبی کریم صلعم اسکے لئے کھڑے ہو گئے اور ہم بھی ان کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ ہم نے پوچھا: یارسول اللہ! یہ تو ایک یہودی کا جنازہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا: جب کبھی تم کوئی جنازہ دیکھو تو کھڑے ہو جایا کرو۔" (بخاری، کتاب الجنائز، حدیث 1311)

"سہل ابن حنیف اور قیس ابن سعد، قادسیہ کے شہر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا اور وہ کھڑے ہو گئے۔ انہیں بتایا گیا کہ یہ جنازہ اس شہر کے ایک رہنے والے کا ہے، یعنی ذِمّیوں کا (اہلِ کتاب جو مسلمانوں کے زیرِ حکومت رعایا ہوں)۔ انہوں نے کہا: ایک مرتبہ ایک جنازہ نبی کریم صلعم کے سامنے سے گزرا تو آپ صلعم کھڑے ہو گئے۔ جب آپؐ کو بتایا گیا کہ یہ ایک یہودی کا جنازہ ہے، تو آپؐ نے فرمایا: کہ کیا وہ ایک انسان نہیں ہے۔" (بخاری، کتاب الجنائز، حدیث 1312)

ایک اور مثال یہ ہے کہ رسول اکرم صلعم کی ایک بیوی صفیہؓ یہودی تھیں اور ایک مرتبہ آپؐ کی عرب بیویوں میں سے حضرت حفصہؓ اور حضرت عائشہؓ نے اس بیوی کے متعلق کہا کہ "ہم دونوں رسول اللہ صلعم کے نزدیک اس سے زیادہ قابلِ قدر ہیں، کیونکہ ہم آپؐ کی بیویاں بھی ہیں اور آپؐ کے چچوں کی بیٹیاں بھی"۔ جب حضرت صفیہؓ نے یہ

بات رسول اکرم صلعم کو بتائی تو آپؐ نے حضرت صفیہؓ کو کہا:

"تم نے (انہیں) یہ کیوں نہ کہا: تم دونوں مجھ سے بہتر کیسے ہو جبکہ میرا خاوند محمدؐ ہے، میرا والد ہارونؑ ہے، اور میرا چچا موسیٰؑ ہے؟" (ترمذی، کتاب المناقب، حدیث 4266)۔

اسی واقعہ کے متعلق ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت حفصہؓ نے طنزیہ طور پر اور تذلیل کرنے کے لئے صفیہؓ کو کہا: "تم تو یہودی کی اولاد ہو"۔ حضرت صفیہؓ نے روتے ہوئے یہ بات رسول اکرم صلعم کو بتائی تو آپؐ نے حضرت صفیہؓ کو کہا:

"اور تم ایک نبی کی بیٹی ہو، تمہارا چچا نبی ہے، اور تم ایک نبی کے تحت (اسکی بیوی) ہو۔ پھر وہ تم پر کس بات کا فخر کر رہی ہے؟" (ترمذی، کتاب المناقب، حدیث 4268)۔

اس حدیث کے مطابق رسولِ اکرم صلعم نے حضرت حفصہؓ کو کہا: "خدا کا خوف کر"۔ یاد رہے کہ حضرت حفصہؓ رسولِ اکرم صلعم کے نہایت قریبی، دیرینہ اور معزز ترین ماننے والے حضرت عمرؓ کی بیٹی تھیں اور حضرت حفصہؓ کا تعلق رسول اکرم صلعم کے قبیلہ سے بھی تھا۔ لیکن رسول اکرم صلعم یہاں اس بات کا برملا ذکر کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت حفصہؓ کا رشتہ تو ایک ہی نبی سے بنتا ہے، یعنی آپؐ سے، مگر حضرت صفیہؓ کا نہ صرف خاوند نبی ہے بلکہ ان کا تعلق حضرت ہارونؑ سے بھی تھا جو ان کے والد کا مقام رکھتے ہیں، اور پھر ان کے چچا حضرت موسیٰؑ بنتے ہیں۔ تو پھر مسلمانوں کے ایمان کے مطابق حضرت صفیہؓ کا تعلق تین نبیوں سے جڑتا ہے۔ رسول اکرم صلعم نے حضرت صفیہؓ کو کہا کہ جن بیویوں کو میری رشتہ دار ہونے کا فخر ہے، جسکی وجہ سے تمہیں "یہودی کی اولاد" ہونے کا طعنہ دیا ہے، تم انہیں یہ جواب دو۔

حضرت صفیہؓ کے متعلق ایک اور بھی اسی قسم کا واقعہ حدیث میں ہے کہ انکا اُونٹ

تھکا ہوا تھا تو حضرت زینبؓ کے پاس ایک فالتو اُونٹ تھا۔ رسول اکرم صلعم نے حضرت زینبؓ کو فرمایا کہ ''اسے اپنا اُونٹ دے دو''۔ انہوں نے جواب دیا: ''میں اس یہودی عورت کو یہ دوں؟'' یہ سن کر رسول اکرم صلعم ناراض ہوئے اور دو مہینوں اور کچھ دن تک حضرت زینبؓ سے آپؐ علیحدہ رہے (ابو داؤد، کتاب السنہ، حدیث 4602)۔

قانونی بنیاد

مسلمانوں کو دوسرے لوگوں کے ساتھ مل جل کر امن سے رہنے کی قانونی بنیاد ذیل کا سادہ لیکن نہایت اہم حکم فراہم کرتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۭ (المائدہ، 1:5)

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اقراروں (عقود) کو پورا کرو۔''

لفظ 'عقود' میں تمام قسم کے معاہدات، اقرار نامے، سمجھوتے اور لین دین کے معاملات وغیرہ شامل ہیں۔ مسلمان جو کسی ایسے غیر مسلم ملک میں رہ رہے ہیں جہاں انہیں عبادت کرنے، مساجد میں جانے اور اپنے آپ کو مسلمان کہنے کی آزادی ہے، وہ اس ملک کے قانونی حکام کے ساتھ ایک معاہدے میں ہیں کہ وہ ملک کے قانون کی پابندی کریں گے، اور تمام معاہدات وغیرہ کا پورا کرنا ان کا مذہبی اور قانونی فریضہ ہونا چاہیے۔

قرآن مجید تمام معاہدات، اقرار نامے اور دیگر وعدوں کو پورا کرنا ایک مسلمان کا بنیادی فرض قرار دیتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح اس کے ایمان کی بنیادی شرط ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لائے اور نماز کے فرائض ادا کرے۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید کی رو سے ایک مسلمان میں ذیل کی اہم خوبیاں ہونی چاہیے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰي صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ (المؤمنون، 7:23 تا 8)

"اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔"

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ ... وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ (البقرہ، 2: 177)

"نیک وہ ہے جو اللہ پر ایمان لاتا ہے اور یوم آخرت، اور فرشتوں، اور کتاب، اور نبیوں پر... اور اپنے اقرار کو پورا کرتا ہے جب وہ کوئی اقرار کرے۔"

ان آیات میں معاہدات اور اقرار ناموں کو پورا کرنے کی ہدایت اسلام کے بنیادی عقائد پر ایمان لانے اور نماز قائم کرنے کی تعلیم کے ساتھ دی گئی ہے۔

جو مسلمان اپنے اقرار یا وعدہ کی خلاف ورزی کرے وہ اللہ کے نزدیک قابل مواخذہ ہے:

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۴﴾ (بنی اسرائیل، 17: 34)

"اور عہد کو پورا کرو کیونکہ ہر عہد کے متعلق سوال کیا جائیگا۔"

جب مسلمان کسی کو حکومت کے امور سپرد کرتے ہیں، یعنی کسی انتخاب کے ذریعہ، تو گو وہ ملک مسلمانوں کا ہو یا غیر مسلموں کا، قرآن مجید کی ذیل کی ہدایات لاگو ہوتی ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ (النساء، 4: 58)

"اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کے سپرد کرو اور جب لوگوں میں فیصلہ کیا کرو۔ تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔"

جن کو بھی کسی قسم کی حکومت یا اختیار کے لئے منتخب کیا جائے، ان کی اہلیت اور قابلیت کے پیش نظر کرنا چاہیے اور انکے لئے انتہائی ضروری ہے کہ وہ سب لوگوں کے درمیان صحیح عدل سے کام لیں۔ اگر کوئی مسلمان ایسے مقام پر فائز ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ سب لوگوں کے مابین، خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، ملک کے قانون کے مطابق عدل و انصاف سے کام لے۔

سیکولر (غیر مذہبی) یا غیر مسلم کی حکومت

قرآن مجید کی سورت 'یوسف' ساری کی ساری بائیبل کے ایک نہایت معروف نبی کی زندگی کے حالات کے متعلق ہے۔ یہ ایک تسلیم شدہ بات ہے کہ قرآن مجید میں جن گذشتہ انبیاء کی تاریخ بیان کی گئی ہے اس سے مقصود مسلمانوں کو ان کے لئے ایک مثالی کردار کے طور پر پیش کرنا ہے۔ حضرت یوسفؑ اپنے پڑ دادا حضرت ابراہیمؑ کی وحدت الٰہی کی تعلیم کی نہ صرف پیروی کر رہے تھے بلکہ اس کی تبلیغ بھی کر رہے تھے جبکہ آپ مصر میں ایک مشرک بادشاہ اور اس کی حکومت کے تحت رہ رہے تھے جو ان تعلیمات کی پیروی نہ کرتے تھے۔ یہ بالکل وہی صورت حالات ہیں جیسے ایک مسلمان آج ایک ایسے ملک میں رہ رہا ہو جہاں کی حکومت غیر مسلم ہو۔

جب حضرت یوسفؑ نے مصر کے بادشاہ کے ایک خواب کی تعبیر یہ کی کہ سات سال وافر غلہ کے بعد سات سال قحط کے آئینگے۔ تو بادشاہ نے خود حضرت یوسفؑ کی تجویز کے مطابق ان کو ملک کے خزانے کا وزیر بنادیا۔ وہ حکمرانوں کے نزدیک ''معزز مرتبہ والے، قابلِ اعتماد'' تھے اور انہیں ملک میں ہر قسم کے اختیارات دیے گئے (سورت یوسف، آیات 54 تا 56)۔ اس سورت میں بیان کردہ قصّے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کافر سلطنت میں قانون اور عدل کا نہایت اعلیٰ معیار تھا۔ جب حضرت یوسفؑ کے بھائی مصر آئے تاکہ قحط کے دنوں میں مکئی کے غلہ کا اپنا حصّہ وصول کریں، تو حضرت یوسفؑ نے

اپنے سگے بھائی بنیامین (Benjamin) کو اپنے پاس رکھنا چاہا جبکہ دوسرے بھائی اپنے وطن کو واپس چلے جائیں۔ لیکن قرآن مجید اس بارے میں یہ بتاتا ہے:

مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ

(یوسف، 12: 76)

"وہ بادشاہ کے قانون کے مطابق اپنے بھائی کو نہ رکھ سکتا تھا جب تک اللہ نہ چاہتا۔"

ملک کے قانون کے مطابق حضرت یوسفؑ اپنے بھائی بنیامین کو اپنے پاس نہ رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس ملک کے قانونِ داخلہ کی پاسداری کی، نہ اس کو توڑا اور نہ ہی اپنی سرکاری حیثیت کا ناجائز استعمال کیا تاکہ اپنے بھائی سے خصوصی سلوک کر سکیں۔[1]

اس سورت میں یہ سبق سکھایا گیا ہے کہ ایک سچا مسلمان، بلکہ ایسا بھی جو اسلام کی تعلیمات کی تبلیغ کرتا ہے، وہ ایک غیر مسلم حکومت کا وفادار کارندہ بھی ہو سکتا ہے اور اس حیثیت میں ایک غیر مسلم ریاست کی اخلاقی اور معاشی بھلائی میں موثر کردار ادا کر سکتا ہے۔ وہ ایک غیر مسلم حکومت کے نظام میں اعلیٰ سطح پر کام کر سکتا ہے اور اسے نہایت دیانت داری سے اس کے قوانین کی پابندی بھی کرنی چاہیے۔ اور اس کا یہ عمل کسی طرح بھی قابل اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ان واقعات میں اس بات کو بھی واضح کیا گیا ہے کہ ایک

[1] یہ الفاظ "جب تک اللہ نہ چاہتا" کا اشارہ ان واقعات کی طرف ہے کہ ایسا ہوا کہ یوسفؑ کے بھائیوں نے شرارت سے شاہی پیالہ کو جس کے ذریعہ لوگوں کو غلہ ناپ کر دیا جاتا تھا، بنیامین کی بوری میں ڈال دیا۔ اور چوری کے الزام میں بنیامین کو روک لیا گیا اور وہ مصر میں رہ گئے۔ اور اس طرح حضرت یوسفؑ کی یہ خواہش پوری کرنے کے سامان پیدا ہو گئے۔ یہ تفسیر کہ خود حضرت یوسفؑ نے اس پیالہ کو بنیامین کی بوری میں رکھوایا، ایک من گھڑت کہانی ہے جو ایک نبی کے کسی طرح بھی شایان شان نہیں ہے۔

غیر مسلم حکومت بھی اعلیٰ اور قابل ستائش قوانین اور عدل کے اعلیٰ معیار پر عمل پیرا ہو سکتی ہے جو مسلمانوں کے لئے بھی اچھی مثال ہو سکتی ہے۔

اخلاقی بنیاد

مندرجہ ذیل قرآنی آیت، جس میں مسلمانوں کے بنیادی فرائض بتائے گئے ہیں، اس سے صاف طور پر اسلامی اخلاق کی وہ تعلیم ملتی ہے جس پر عمل کرنے سے مسلمان غیر مسلم لوگوں کے ساتھ امن، سکون اور دوستی کی زندگی گزار سکتے ہیں:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ (النساء، 4: 36)

”اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور قریبی رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور قربت کے پڑوسیوں اور دور کے پڑوسیوں اور سفر میں ساتھیوں اور مسافر اور جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے (یعنی تمہارے ماتحت)، انکے ساتھ بھی (احسان کرو)۔“

اس آیت میں نہایت وضاحت سے ایک اجنبی ہمسایہ (وَ الْجَارِ الْجُنُبِ) کو بھی ان لوگوں میں شامل کیا گیا ہے جن کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ضروری ٹھہرایا گیا ہے گو اس کا تعلق کسی ملک یا مذہب سے ہو۔ اور اسکو اس فہرست میں شامل کیا جس میں والدین، رشتہ دار اور اپنی قوم کے پڑوسیوں کو کیا گیا ہے۔ پھر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جن لوگوں کا بھی یہاں ذکر کیا گیا ہے، والدین، رشتہ دار، یتیم وغیرہ، وہ غیر مسلم بھی ہو سکتے ہیں جن

کے ساتھ ایک مسلمان کو نیک سلوک کرنا چاہیے۔ کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنا کردار کا ایک مثبت اور عملی پہلو ہے، جو کسی کو محض نقصان نہ پہنچانے سے بڑھ کر بات ہے۔

اس آیت میں ان لوگوں میں جن کے ساتھ ایک مسلمان کو نیکی کا سلوک کرنا چاہیے۔ ''سفر میں ساتھی اور مسافر'' کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس لئے جب ہمسفروں کو معمولی نقصان تک پہنچانا ایک مسلمان کو منع ہے، تو ان کو جان بوجھ کر ہتھیاروں سے قتل کرنا، جیسا کہ بمب سے ہوائی جہاز کو گرانا جن میں وہ آپکے ساتھ سوار ہیں، اسلام کی بنیادی تعلیمات کے صریحاً خلاف ہے۔

احادیث میں بے شمار رسولِ کریم صلعم کے اقوال پائے جاتے ہیں جن میں ہمسایہ کے ساتھ نیک سلوک کی پر زور تلقین کی گئی ہے۔ چند ذیل میں ہیں جو بخاری کی کتاب الادب (احادیث نمبر 6014، 6016، 6018 اور 6019) سے لیے گئے ہیں:

1- ''جبرائیل برابر مجھے ہمسائے کے ساتھ (نیک سلوک کی) تاکید کرتا رہا یہاں تک کہ مجھے گمان ہوا کہ وہ اسے (میرا) وارث بنادے گا۔''

2- ''نبیؐ نے فرمایا: 'اللہ کی قسم! وہ شخص ایمان نہیں لاتا، اللہ کی قسم! وہ شخص ایمان نہیں لاتا، اللہ کی قسم! وہ شخص ایمان نہیں لاتا'۔ جب پوچھا گیا: 'وہ کون ہے، یارسول اللہ؟': آپؐ نے فرمایا: 'ایسا شخص جس کا ہمسایہ اس کے شر سے محفوظ نہیں'۔''

3- ''جو شخص اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لاتا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے ہمسایہ کو تکلیف نہ پہنچائے۔''

4- ''جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لاتا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے ہمسایہ کی عزت کرے۔''

صحیح مسلم میں ہمسایوں کے متعلق احادیث کو کتاب الایمان میں درج کیا گیا ہے جس میں ان بنیادی عقائد اور اعمال کا ذکر ہے جن کو مسلمان ہونے کے لئے قبول کرنا ضروری ہے۔ وہاں ذیل کی حدیث موجود ہے:

"نبیؐ نے فرمایا: تم میں سے کوئی ایمان نہیں لاتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے — یا آپؐ نے فرمایا اپنے ہمسایہ کے لئے — وہی کچھ پسند نہ کرے جو وہ خود اپنے لئے پسند کرتا ہے۔" (کتاب الایمان، باب 17)

جس طرح قرآن مجید کی سورت النساء کی آیت 36 میں، جسکا حوالہ دیا جا چکا ہے، اپنی قربت کے ہمسائے اور کسی دوسرے مذہب کے ہمسائے کا یکساں طور پر ذکر کیا گیا ہے، اسی طرح ہی اس حدیث کوئی فرق نہیں کیا گیا کہ ہمسایہ کا تعلق کس مذہب یا قوم سے ہے۔

اگر مسلمان قرآن مجید اور رسول اکرم صلعم کی ان واضح، صاف اور مستند تعلیمات پر انفرادی، اجتماعی اور ملکی سطح پر عمل کریں تو وہ اپنے غیر مسلم ہمسایوں کے ساتھ امن اور ہم آہنگی میں زندگی گذار سکتے ہیں۔ مذکورہ بالا قرآنی آیت (النساء، 4: 36) کے الفاظ کی اصطلاح میں اس دنیا کے مسلمان اور غیر مسلمان نہ صرف ایک دوسرے کے ہمسائے ہیں، بلکہ "سفر میں ساتھی" بھی ہیں کیونکہ وہ اس کرہِ ارض کی گردش میں اکٹھے سفر کر رہے ہیں اور زندگی کے سفر میں بھی آپس میں ساتھی ہیں۔

10- جہاد کے بارے میں ممتاز علماء اور مفکرین کی آراء

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ گذشتہ صفحات میں بیان کردہ اسلامی تعلیمات کی تشریحات کو پیش کرنے والے صرف بعض مخصوص اور محدود گروہ ہی ہیں جو عام روش اور جمہور سے ہٹ کر سوچ رکھتے ہیں، یا ان خیالات کو زیادہ وسیع طور پر بھی قبول کیا جاتا ہے۔ یہاں فرق کرنا ضروری ہے ایک طرف سنجیدہ مفکرین، محققین اور مصنفین میں، جو اسلام کے بارے میں حقیقت پسندی اور آزادی سے غور و فکر کرتے ہیں، اور دوسری طرف ایسے مقبولیت پسند مذہبی علماء میں جو لوگوں کو جہالت اور تعصب میں الجھائے رکھتے ہیں تاکہ ان پر اپنا اثر و رسوخ قائم رکھیں اور سادہ لوح عوام میں مقبول رہیں۔ آزاد اور روشن خیال علماء انہی طرز کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں جو ہم اس کتابچہ میں کر چکے ہیں۔

ذیل میں ہم جدید زمانہ کے نو ممتاز عالموں کی تحریرات میں سے اقتباس پیش کریں گے جن میں چار معروف عالم جنہوں نے قرآن مجید کے انگریزی میں تراجم کئے ہیں اور دو غیر مسلم مصنفین اور محققین شامل ہیں۔[1]

1۔ عبداللہ یوسف علی صاحب

عبد اللہ یوسف علی صاحب کا انگریزی ترجمہ مع تفسیری نوٹ پہلی مرتبہ 1934ء میں شائع ہوا اور شاید مسلمانوں میں یہ مقبول ترین انگریزی ترجمہ ہے۔ ذیل میں ہم ان کے تفسیری حواشی میں سے چند اقتباس درج کرتے ہیں۔

1- ”جبر تو مذہب کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ اولاً مذہب کی بنیاد ایمان

---

[1] یہ اقتباسات، سوائے ایک کے، سب اصل میں انگریزی میں ہیں جنکا ترجمہ ہم نے یہاں پیش کیا ہے۔ صرف علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کا حوالہ (نمبر 6) اردو میں ہے جو ہم نے اصل اردو میں دیا ہے۔

اور ذاتی مرضی پر ہوتی ہے اور یہ دونوں باتیں بے معنی ہو جاتی ہیں اگر ان کو زور زبردستی سے پیدا کیا جائے۔(حاشیہ نمبر300، سورت 2، آیت 256)

2- ''ایمان والوں کو بے صبری اور غصّہ کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے جب ان کا مقابلہ غیر ایمان والوں سے ہو۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کو ایمان کے بارے میں زبردستی کے میلان کو روکنا ہو گا، یعنی دوسروں پر جسمانی طور پر زبردستی سے ایمان کو ٹھونسا جائے، یا کسی دیگر جبر کے طریقے سے جیسا کہ سماجی دباؤ یا مال و دولت، عہدہ یا دیگر مالی مفادات کا لالچ۔ ایمان جسکا زور زبردستی سے اقرار کروایا ہو، وہ ایمان کہلانے کے قابل نہیں۔(حاشیہ1480، سورت 10، آیت 99)

3- ''محض وحشیانہ جنگ و جدل جہاد کی ساری روح کے ہی خلاف ہے۔ جبکہ ایک مخلص عالم کا قلم، مبلغ کا وعظ یا پھر ایک امیر شخص کے رضاکارانہ عطیہ جات، جہاد کی زیادہ ترین قابل قدر صورتیں ہو سکتی ہیں۔''(حاشیہ1270، سورت 9، آیت 20)

4- ''صرف اپنے دفاع کے لئے جنگ کرنا جائز ہے لیکن وہ بھی واضح حدود کے اندر۔ جب جنگ لڑی جائے تو وہ پوری طاقت اور ہمت سے لڑی جائے، مگر بے قابو طور پر نہیں، اور اس کا بنیادی مقصد اللہ کی عبادت کے لئے امن اور آزادی کو قائم کرنا ہو۔ بہر حال متعین کردہ حدود کی کسی صورت میں بھی خلاف ورزی نہ کی جائے۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور کمزور لوگوں کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے۔ نہ درختوں کو کاٹا جائے اور نہ ہی فصلوں کو برباد کیا جائے۔ اگر دشمن امن کے لئے شرائط ماننے کو تیار ہو جائے تو اس سے ہر گز پہلو تہی نہ کی جائے۔''(حاشیہ 204، سورت 2، آیت 190)

5- ''عمومی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام امن، خیر خواہی، باہم افہام و تفہیم اور خیر سگالی کا دین ہے اور کبھی بھی ظلم کی حمایت نہ کرے گا۔ اور اس دین کے ماننے والے عزت، عدل اور اپنے مقدس دین کی خاطر جان دینے کو ارزاں سمجھیں گے۔ ان کی زندگی

کا بنیادی مقصد ایک دلیرانہ نیکی کی زندگی گزارنا ہے جس میں بے نفسی، نرمی اور رحم دلی بھی شامل ہو۔" (حاشیہ 205، سورت 2، آیت 191)

6- "اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو جس حد تک ممکن ہو قابو میں رکھیں۔ طاقت ایک خطرناک ہتھیار ہے۔ اس کو اپنے دفاع یا خود حفاظتی کے لئے تو استعمال کرنا ضروری ہو سکتا ہے لیکن ہمیں ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں اپنے آپ پر قابو رکھنا اس کو زیادہ عزیز ہے۔ حتیٰ کہ جب ہم جنگ کریں تو وہ بھی ایک اصول کی خاطر ہونی چاہیے، نہ کہ جذبہ، جنون اور شوق کی وجہ سے۔" (حاشیہ 210، سورت 2، آیت 194)

2۔ محمد مارماڈیوک پکھتال

مارماڈیوک پکھتال (Marmaduke Pickthall) ایک برطانوی ناول نویس تھے جنہوں نے 1917ء میں اسلام قبول کیا۔ انہوں نے اسلام پر نہایت فکر انگیز لیکچر اور خطبات دیے اور ان کا قرآن مجید کا ترجمہ دسمبر 1930ء میں شائع ہوا جو معروف تراجم میں شمار ہوتا ہے۔ 1919ء کے اوائل میں لندن میں ایک تقریر یا خطبہ میں، جو بعد میں "رواداری" (Tolerance) کے عنوان سے شائع ہوا، اس میں انہوں نے کہا:

"مذہبی رواداری اسلام کی اصل روح ہے۔ قرآن مجید اس کو فرض قرار دیتا ہے اور محمد صلعم نے اپنی زندگی میں ایک نبی اور ایک حاکم ہونے کی حیثیت میں جنگ اور امن دونوں صورتوں میں اسپر عمل کرنا دکھایا۔ وہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے اس بارے میں یہ اعلان کیا، ایسے الفاظ میں جن کو کوئی غلط مفہوم نہیں دیا جا سکتا، کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک مذہب اور قوم کے لوگوں کو اچھے اعمال کا اجر دیگا، انکے عقائد کے مطابق نہیں . . . بلکہ ان کے اعمال کے مطابق یعنی انہوں نے کس حد تک انسانیت کی خدمت کے کام کئے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف رکھے، ہم مسلمان جن کے پاس مستقل طور پر رحم دلی اور روا

داری کے سلسلہ میں اللہ کے مقدس احکام ہیں ہم نے اپنی گذشتہ تاریخ میں کافی حد تک تعصب اور غیر رواداری کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن اس سے لوگوں کو یہ رائے نہ قائم کر لینی چاہیے کہ جب ہم مسلمان اس قسم کا رویہ اختیار کرتے ہیں تو ہم رسول اکرم صلعم کے عظیم اسوہ کی پیروی کرتے ہوئے ایسا کرتے ہیں یا ہمارا دین اس کی تعلیم دیتا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ جب ہم ایسے غلط رویئے کا مظاہرہ کرتے ہیں تو ہم اس نمونہ کو قطعاً نظر انداز کر رہے ہوتے ہیں اور اپنے دین کو جھٹلا رہے ہوتے ہیں۔

"اب از راہ کرم اس تاثر کو اپنے ذہنوں سے نکال دیں . . . کہ محمد صلعم جنگ میں ایک انتہائی جنونی یا سخت گیری کا رویہ اپناتے تھے یا انہوں نے کبھی بھی اپنی زندگی میں حملہ کی پہل کی ہو۔ بارہ سال تک مکہ میں انہوں نے انتہائی ظلم وستم میں صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ حالانکہ وہ کسی وقت بھی کفار مکہ کے کسی گروہ کی مدد سے اپنی حفاظت کر سکتے تھے۔ انہوں نے آخر کار خود کو اور اپنے صحابہؓ کو ایک جگہ ہجرت کرنے کا حکم دیا جہاں کے لوگوں نے انکی طرف داری کی اور وہ امن کے خواہش مند تھے۔ صرف جب دشمن ایک بڑی فوج لے کر جنگ کے لئے روانہ ہو گیا تا کہ ان کو اس جگہ سے جہاں وہ نسبتاً امن سے رہ رہے تھے نکال باہر کرے اور مسلمانوں کی جمعیت کو برباد کر دے۔ تب انہوں نے اپنے ساتھیوں کو جنگ کرنے کی اجازت دی . . . دشمن کی اب یہ کوشش تھی کہ وہ جنگ، قتل وغارت، ظلم وستم اور دھوکا دہی کے ذریعہ اسلام کو نیست و نابود کر دے۔ لیکن اس حالت میں بھی محمد صلعم نے جب مکہ فتح کر لیا تو انہی لوگوں کو معاف کر دیا۔ اس سے قبل دنیا نے معافی اور رحمدلی کا ایسا مظاہرہ کبھی نہ دیکھا تھا . . .

"جہاں تک یہودیوں اور عیسائیوں اور ان لوگوں کا تعلق ہے جو ایک ہی خُدا کی عبادت اور یوم حساب پر ایمان رکھتے ہیں، اگرچہ ان کے پادریوں اور ربائیوں نے سچائی کو اپنی خوش فہمی کے خیالی تصورات سے دھندلا کر دیا ہے، پھر بھی وہ ایک رنگ میں ایسے

مسلمان ہیں جو صحیح راستہ سے بھٹک گئے ہیں۔ ان میں وہ لوگ جو نیک اعمال کرتے ہیں اور جو دوسروں پر ظلم و ستم نہیں ڈھاتے، ان کو بھی تو مسلمان گردانا جاتا ہے۔ رسولِ اکرم صلعم نے یہودیوں اور عیسائیوں سے انتہائی رواداری کا سلوک کیا۔ اور ان مذاہب کے لوگوں کو ہر دور میں مسلمانوں کی سرزمین میں آباد ہونے کی آزادی رہی ہے۔ لیکن ان یہودیوں اور عیسائیوں کو جنہوں نے رسولِ اکرم صلعم پر حملہ کیا یا ان سے دغا بازی کی آپؐ نے ان کی مخالفت کی یا ان کو سزا دی۔ لیکن اس سے ان مذاہب کے متعلق آپؐ کی رواداری میں کوئی کمی نہ آئی... لیکن رسولِ اکرم صلعم اور اوائل کے مسلمانوں نے کبھی بھی مذہبی رواداری کو نہ چھوڑا، اگرچہ ان پر چاروں طرف سے حملے کئے گئے اور تباہی کا خطرہ لاحق تھا۔ عیسائیوں کے خلاف جنگوں میں انہوں نے گرجاگھروں، راہب خانوں اور ان کی مذہبی شخصیتوں کی عزت و احترام کا خاص خیال رکھا اور کبھی مفتوح لوگوں کو انکا دین چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا۔ اسلام کی تعلیمات میں یہ طریق کار صدیوں سے ایک قانون کی حیثیت رکھتا رہا ہے اگرچہ مسلمان بعض اوقات اس پر پوری طرح نہیں چلے۔" (ماہنامہ "اسلامک ریویو"، ووکنگ، انگلینڈ، مارچ 1919، صفحات 90 تا 95)

3۔ علامہ محمد اسد صاحب

علامہ محمد اسد کا پیدائشی نام لیوپولڈ وائس (Leopold Weiss) تھا اور آپ ایک یہودی خاندان میں 1900ء میں پیدا ہوئے۔ آپ آسٹریا میں پل کر جوان ہوئے اور آپ نے 1926ء میں اسلام قبول کیا۔ ان کے قرآن مجید کا معروف انگریزی ترجمہ مع تفسیر Message of the Quran ("قرآن مجید کا پیغام") کے نام سے جبرالٹر (جو اسپین کے نزدیک ہے) سے 1980ء میں شائع ہوا۔ ان کی وفات 1992ء میں ہوئی۔ ان کے تفسیری حواشی میں سے اقتباس ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

1- ”مندرجہ بالا آیت میں مذہب یا ایمان کے بارے میں ہر امر میں جبر کی قطعی ممانعت کی بنا پر تمام مسلمان فقہا، کسی استثنا کے بغیر، اس بات پر متفق ہیں کہ کسی بھی صورتِ حال میں جبر سے لوگوں کو مسلمان بنانا کالعدم اور بے اثر ہے، اور کسی غیر مسلم کو زبردستی اسلام قبول کرانے کی کوئی بھی کوشش ایک بدترین گناہ ہے۔ یہ حتمی فیصلہ اس عمومی اور وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے غلط اور بے بنیاد تصور کو، کہ اسلام غیر مسلموں کے سامنے ”اسلام یا تلوار“ میں سے ایک کا انتخاب کرنے کی پیش کش کرتا ہے، یکسر رد کرتا ہے۔“(حاشیہ نمبر249، زیر آیت 2: 256)

2- ”اس لئے جہاد کے معنی اللہ کی راہ میں کوشش کرنا ہے، جہاں کوشش کا مفہوم اسکے وسیع ترین رنگ میں ہے۔ یعنی اس کا اطلاق نہ صرف باقاعدہ جنگ پر بلکہ ہر ایسی نیک کوشش جو جسمانی نہیں بلکہ اخلاقی ہے، اس پر بھی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر رسول اکرم صلعم نے انسان کے اپنے جذبات اور کمزوریوں کے خلاف کوشش کو سب سے بڑا جہاد کہا ہے۔“(حاشیہ نمبر122، زیر آیت 4: 95)

3- ”یہ اور اس سے اگلی آیات میں نہایت غیر مبہم الفاظ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو صرف دفاعی (اس لفظ کے وسیع تر مفہوم میں) جنگ کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔... ”اللہ کی راہ میں“ جنگ کا دفاعی ہونا... اس آیت کے الفاظ سے خود ہی ظاہر ہے یعنی ”ان لوگوں کے خلاف جنگ کرو جو تمہارے خلاف جنگ کریں“ اور اس کی مزید وضاحت 39:22 میں یوں کی گئی ہے کہ ”ان لوگوں کو جنگ کرنے کی اجازت دی گئی ہے جن کے خلاف جنگ ناجائز بنا پر کی گئی ہے“... یہ بنیادی اصول کہ جنگ صرف اپنے دفاع کے لئے جائز ہے، جس طرح کہ یہ ابتدا میں سکھایا گیا اسی طرح اس کو سارے قرآن مجید میں تسلسل سے برقرار رکھا گیا ہے، جیسا کہ ظاہر ہوتا ہے 8:60 اور 91:4 کے آخر سے، جو دونوں مندرجہ بالا آیت کے بعد کے زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں“۔(حاشیہ نمبر

167، زیر آیت 2: 190)

5- ”پس اگر چہ ایمان لانے والوں کو، جب ان پر حملہ کیا جائے، جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تاہم مندرجہ بالا آیت کے آخری الفاظ اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ جب جنگ کی جائے تو ہر قسم کے ظلم و ستم اور زیادتی سے پرہیز کیا جائے، جیسے جنگ میں حصّہ نہ لینے والوں کو قتل کرنا۔“ (حاشیہ نمبر 172، زیر آیت 2: 194)

6- ”ان احکامات کے مطابق کہ ”اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تُو بھی اس کی طرف جھک جا“ (61:8) اور ”اگر وہ (لڑائی سے) احتراز کریں، تو تمام قسم کی دشمنی کو ختم کر دیا جائے“ (193:2)، ایمان لانے والوں کے لئے لازمی ہے کہ وہ دشمن سے صلح کریں اگر وہ منصفانہ بنیاد پر سمجھوتے کے لئے آمادہ ہو۔ اسی طرح ان کو دشمنوں میں سے ان افراد کا ہر طرح لحاظ کرنا چاہیے جو دشمنی کی کارروائیوں میں عملی طور پر شریک نہیں۔“ (حاشیہ نمبر 105، زیر آیت 4: 86)

4۔ ٹی۔ بی۔ ارونگ صاحب

ڈاکٹر تھامس ارونگ (Thomas Irving) ایک یونیورسٹی پروفیسر اور مصنف تھے، جن کا تعلق کینیڈا سے تھا۔ انہوں نے 1950ء کے دھاکے میں اسلام قبول کیا اور پھر قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ کیا جو 1985ء میں امریکہ میں شائع ہوا۔ انہوں نے ایک مقالہ میں، جس کا موضوع قرآن مجید کا ترجمہ کرنے کے متعلق تھا، جہاد کے بارے میں یہ تحریر کیا:

”ایک اور نکتے کا ذکر بھی کر دیا جائے۔ جہاد، یا روحانی ترقی کے لئے جدوجہد یا کوشش، اسلام کے پانچ ارکان میں سے نہیں ہے۔ اس لفظ کے صحیح ترجمہ میں اس کا ہرگز مطلب مقدس جنگ نہیں۔ ہاں یہ مطلب اس کے معنوں کو وسعت دے کر دیا جا سکتا

ہے، لیکن اس کو یہ مطلب دینے سے، جو اخباروں میں اسے دیا جاتا ہے، اس لفظ کی تذلیل ہو گئی ہے۔" (اسلامک پرسپیکٹوز، Islamic Perspectives، اسلامک فاونڈیشن، انگلستان، 1979، ص132)۔

5۔ مولوی چراغ علی صاحب

مولوی چراغ علی صاحب نے 1885ء میں حیدرآباد دکن سے انگریزی میں ایک مبسُوط کتاب شائع کی A Critical Exposition of the Popular Jihad یعنی "جہاد کے معروف تصور کا تنقیدی جائزہ"، جو 350 صفحات پر مشتمل تھی۔ اس کے ابتدا میں ہی انہوں نے لکھا:

"اس کتاب کے شائع کرنے کا میرا بڑا مقصد یہ ہے کہ اسلام کے بارے میں یورپی اور عیسائی مصنفین کے ذہنوں میں جو عام طور پر غلط تاثرات ہیں ان کو دور کیا جائے کہ محمدؐ نے قریش، عرب کے دیگر قبائل، اور یہودیوں اور عیسائیوں کے خلاف اس لئے جنگیں کیں کہ انہیں مغلوب کیا جائے، یا انہیں نیست و نابود کر دیا جائے یا ان سے اسلام قبول کروایا جائے۔ اور یہ کہ محمدؐ کے ایک ہاتھ میں قرآن مجید اور ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور وہ لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ میں نے اس کتاب میں کوشش کی ہے، میرے نزدیک کافی دلائل کی بنیاد پر، یہ ثابت کرنے کی کہ نہ تو محمدؐ کی جنگیں جارحانہ تھیں، اور نہ ہی انہوں نے کسی قسم کا زور و جبر مذہب کو پھیلانے کے لئے استعمال کیا۔ آپؐ کی تمام جنگیں دفاعی تھیں۔" (ایڈیشن دوم، شائع شدہ کریم سنز، کراچی، 1977ء، ص i)

آگے چل کر وہ ایک برطانوی مصنف کا حوالہ دیتے ہیں جو یہ الزام لگاتا ہے کہ "اسلام کے ماننے والوں پر جو بنیادی فرض عائد کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے اس کے نمائندے بن کر ان لوگوں کو موردِ عذابِ الٰہی بنائیں جو ایمان نہیں لائے"۔

اس کا جواب دیتے ہوئے، مولوی چراغ علی صاحب لکھتے ہیں:

"محمدؐ نے قبیلہ قریش اور یہودیوں کے خلاف جنگ اس لئے نہیں کی کہ انہوں نے ان کے پیغام کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اور نہ ہی اس لئے کی کہ وہ لوگوں پر اللہ کا غضب نازل کرنے کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔ اس کے بالمقابل آپؐ نے فرمایا: "حق تمہارے رب کی طرف سے ہے، سو جو کوئی چاہے اسے ایمان لانے دو، اور جو کوئی چاہے اسے کافر ہونے دو" (29:18)۔ "دین میں کوئی زبردستی منوانا نہیں" (256:2)۔ ... حتیٰ کہ جن دنوں جنگ بھی جاری تھی وہ لوگ جو ایمان نہیں لائے تھے ان کو اجازت تھی کہ وہ مسلمانوں کے پاس آکر اسلامی تعلیمات کے بارے میں وعظ سنیں، اور پھر ان کو حفاظت سے اپنے گھروں تک پہنچایا جاتا تھا (6:9)۔" (ص42)

"... محمدؐ نے صرف دفاعی اغراض کے لئے تلوار اٹھائی۔ اگر مدینہ میں سکونت اختیار کرنے کے بعد وہ اپنا دفاع نہ کرتے تاکہ قریش اور ان کے حلیف قبیلوں کے حملوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکیں تو عین ممکن تھا کہ آپ اور آپکے ماننے والوں کو نیست و نابود کر دیا جاتا۔ انہوں نے اپنی جانوں کی حفاظت کے لئے اور اپنی اخلاقی اور مذہبی آزادی کی بقا کے لئے لڑائی کی۔

اس پہلو سے اس جنگ کو مذہبی جنگ کہا جا سکتا ہے، کہ یہاں مخاصمت مذہبی بنیاد پر شروع ہوئی۔ اس لئے کہ قریش نے مسلمانوں پر ظلم و ستم کیے اور ان کو مکہ سے نکال دیا صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے اپنے آباؤاجداد کا مذہب چھوڑ کر، یعنی بُت پرستی کو چھوڑ کر، اسلام قبول کر لیا اور ایک خُدا کی عبادت شروع کر دی۔ لیکن اس لحاظ سے ہر گز یہ ایک مذہبی جنگ نہ تھی کہ کفار پر جارحانہ حملہ کر کے آپؐ جبراً اپنا مذہب ان پر ٹھونسیں۔" (ص43)

مصنف نے 30 صفحات پر مشتمل ایک تتمہ بھی اپنی کتاب کے ساتھ لکھا ہے جس

میں یہ مطالعہ کیا گیا ہے کہ قرآن مجید میں لفظ 'جہاد' کن کن معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے مستند عربی لغات کے حوالے بھی دیے ہیں اور مغربی مصنّفین کے اس غلط ترجمہ کو رد کیا ہے کہ 'جہاد' کے لفظی معنی 'جنگ' ہیں۔ مصنف لکھتے ہیں:

"جہاد کے لفظ کو دشمن سے لڑائی کے لئے استعمال کرنا صرف (قرآن کے) بعد کے زمانہ کا دیا ہوا اصطلاحی معنی ہے۔" (ص164)

"تمام اہل لغت، مفسرین اور فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جہاد کے معنی پرانی عربی میں محنت اور سخت کوشش ہے اور یہ کہ اس کے معنی میں تبدیلی، یا اس کو (جنگ کا) اصطلاحی معنی دیا جانا، قدیم دور کے بعد، یعنی قرآن مجید کی اشاعت کے بہت بعد، کی بات ہے۔" (ص170)

"جہاد کے معنی جنگ کرنا نہیں . . . مجھے یقین ہے کہ میں نے مترجمین و مفسرین اور قرآن مجید کی آیات کے متن کے بغور تقابلی جائزہ سے یہ واضح طور پر ثابت کر دیا ہے کہ لفظ 'جہد' یا 'جہاد' پرانی عربی میں اور پھر جن معنوں میں قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے اس سے مراد جنگ یا لڑائی کرنا نہیں بلکہ اپنی انتہائی کوشش، محنت یا جفاکشی ہے۔ . . . میرا موقف یہ نہیں ہے کہ قرآن مجید میں لڑائی یا جنگ کرنے کے احکامات نہیں موجود۔ ایسی متعدد آیات موجود ہیں جن میں رسول اکرم صلعم کے ماننے والوں کو دفاعی جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، لیکن جارحانہ حملہ کی اجازت نہیں۔" (ص192)

6۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال، پاکستان کے قومی ہیرو، دنیا کے معروف شاعر اور اسلامی فکر کے فلاسفر، جو کسی تعارف کے محتاج نہیں، اپنے ایک اردو خط میں جہاد کے بارے میں یہ لکھتے ہے:

"معترض کا یہ کہنا کہ اقبال اس دَور ترقی میں جنگ کا حامی ہے غلط ہے۔ میں جنگ کا حامی نہیں ہوں اور نہ کوئی مسلمان شریعت کے حدودِ متعینہ کے ہوتے ہوئے اس کا حامی ہو سکتا ہے۔ قرآن کی تعلیم کی رُو سے جہاد یا جنگ کی صرف دو صورتیں ہیں۔ محافظانہ اور مصلحانہ۔ پہلی صورت میں یعنی اس صورت میں جب کہ مسلمانوں پر ظلم کیا جائے اور ان کو گھروں سے نکالا جائے مسلمانوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت ہے، نہ حکم۔ دوسری صورت جس میں جہاد کا حکم ہے (قرآن مجید میں) ۹:۴۹ میں بیان ہوئی ہے۔ ان آیات کو غور سے پڑھیئے تو آپ کو معلوم ہو گا وہ چیز جس کو سر سیمول ہور جمعیت اقوام[2] کے اجلاس میں collective security کہتا ہے قرآن نے اسی کا اصول کس سادگی اور فصاحت سے بیان کیا ہے۔ . . . جنگ کی مذکورہ بالا دو صورتوں کے سوائے مَیں اور کسی جنگ کو نہیں جانتا۔ جوع الارض کی تسکین کے لئے جنگ کرنا دینِ اسلام میں حرام ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس، دین کی اشاعت کے لئے تلوار اٹھانا بھی حرام ہے۔" (اقبال نامہ، حصہ اوّل، مجموعہ مکاتیب اقبال، لاہور، 1945، صفحات 203 تا 204۔ یہ اقتباس ہم نے اصل اردو کے مطابق یہاں دیا ہے۔)

7۔ چیف جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن صاحب

ڈاکٹر ایس اے رحمٰن جو 1960ء کے دھاکہ میں پاکستان کی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس رہے، انہوں نے ایک کتاب Punishment of Apostasy in Islam انگریزی میں لکھی، یعنی "اسلام میں مرتدّ کی سزا"۔ اسکی دوبارہ اشاعت 'کتاب بھَون'، نیو دہلی، نے 2006ء میں کی۔ اس کے 140 صفحات ہیں جن میں مرتد کے مسئلہ کے بارے میں قرآن مجید، حدیث، اور انکے قدیم اور جدید تراجم اور تفسیروں، اور

[2] سر سیمول ہور Sir Samuel Hoare ہیں، اور جمعیت اقوام League of Nations ہے۔

دیگر اسلامی کتب اور اوائل کے فقہاء کی تحریرات کی روشنی میں نہایت تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ ہم ذیل میں مصنف کی آراء اور نتائج درج کرتے ہیں:

"جن معاملات کا فیصلہ انسانی ضمیر نے کرنا ہوتا ہے، ان کے متعلق قرآن مجید کسی شخص کی آزادی پر کوئی پابندی نہیں لگاتا۔" (ص13)

"ایمان کے بارے میں دباؤ یا جبر کی قرآن کے سماجی نظام کے ڈھانچہ میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس بارے میں انسانیت کے جذبہ سے سرشار رواداری کی واضح ہدایت مسلمانوں کو قرآن مجید کی متعدد آیات میں دی گئی ہے، جن میں ایک ایسے معاشرے کو تسلیم کیا گیا ہے جس میں مختلف قسم کے نظریات کا وجود ہو۔"(ص15)

"ایک اچھی زندگی گزارنے کے لئے قرآن مجید نے ہدایات فراہم کی ہیں لیکن اس طریق پر نہیں کہ انسانی وقار کو دبایا جائے۔ موت کے بعد کی زندگی کے مختلف نظارے، جس میں دنیاوی زندگی کے اچھے اعمال کے اچھے نتائج حاصل ہونگے، یہ سب باتیں اہل بصیرت لوگوں کے سامنے پیش کی گئی ہیں۔ لیکن زندگی گزارنے کے لئے اپنی پسند کی راہ اختیار کرنے کا حق ہر فرد کو دیا گیا ہے۔ کوئی بھی عمل جو زبردستی سے کروایا گیا ہو، اس کا کرنے والا اس سے کوئی جزا نہیں حاصل کر سکتا۔ . . . اسلام تو ہے ہی وہ جسکو لوگ جنہیں (اسے ماننے یا نہ ماننے کی) آزادی ہے وہ بالکل اپنی مرضی سے اسے قبول کریں۔" (ص31)

"سماجی اور سیاسی نظام کے بارے میں ایک اصول جو اللہ کی کتاب میں نمایاں نظر آتا ہے اس کو بطور خلاصہ ان اعلیٰ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: "دین میں کوئی جبر نہیں"۔ اس اصول کی تصدیق قرآن مجید کی متعدد دیگر آیات سے بھی ہوتی ہے جن میں واضح طور پر صراط مستقیم سے انحراف کرنے کا حق تسلیم کیا گیا ہے گو ایسا کرنے کو ناپسند کیا گیا ہے۔ . . . انسان کو اس بات کی آزادی حاصل ہے کہ وہ حق اور باطل میں سے کسی ایک کو

اختیار کرے اور رسول اکرمؐ کا کام یہ ہے کہ ان تک پیغام کو پہنچادیں اور اس پر اپنی زندگی میں عمل کر کے بطور مثال دکھائیں اور باقی اللہ پر چھوڑ دیں۔ وہ لوگوں پر نگہبان نہیں کہ انکو بعض عقائد اختیار کرنے پر مجبور کریں۔ ضمیر کی آزادی اچھی زندگی کی ایک قابل قدر بنیاد ہے اور اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے جب حدیث میں بیان کردہ واقعات، حدیث کے تاثرات، خلفائے راشدین کے زمانے میں عمل اور فقہاء کی آراء کا مطالعہ کیا جائے۔ ان میں سے کسی سے ایسے نتائج نہیں اخذ کرنے چاہئیں جو اللہ کے کلام کے الفاظ یا اسکے مقصد و منشا سے ہٹ کر ہوں۔ (ص130)

''متعلقہ قرآنی آیات کے بارے میں ہمارے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرتد کی سزا کو اگلی زندگی تک ملتوی کر دیا گیا ہے، بالکل اس شخص کی سزا کی طرح کو جو شروع سے ہی کافر تھا۔ قرآن میں قطعاً اس بات کا کوئی ذکر موجود نہیں کہ اس دنیاوی زندگی میں ایک مسلمان کو ایمان سے انحراف کی سزا دی جائے... ایسے انسان کو اس بات کی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اپنی مرضی کے مذہب کو مانے اور اس کی تبلیغ کرے جب تک کہ وہ قانون اور اخلاق کی حدود کے اندر رہے۔ اور اسے ایک پر امن شہری کے تمام دیگر حقوق حاصل ہونے چاہئیں جو مسلمان شہریوں کو حاصل ہیں۔'' (صفحات 130 تا 131)

8۔ ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو۔ لائٹنر

ڈاکٹر گوٹلب وِلھلم لائٹنر صاحب (Dr Gottlieb Wilhelm Leitner) جن کا انتقال 1899ء میں ہوا، زبانوں کے ماہر، یونیورسٹیوں کے کارکن، اور عربی اور اسلام کے ایک مستند عالم تھے۔ آپ گورنمنٹ کالج لاہور کے پہلے پرنسپل، بلکہ اس کالج کے بانی تھے۔ آپکی کوششوں سے لاہور میں پنجاب یونیورسٹی وجود میں آئی، جسکے آپ پہلے رجسٹرار بنے، اور اسکے بعد لاہور میں اورینٹل کالج بھی آپکی کوششوں سے قائم ہوا۔ 1889ء میں

آپنے انگلستان کے شہر ووکنگ (Woking) میں مسجد بنوائی جو بنام شاہجہان مسجد کے مشہور ہے۔

ڈاکٹر لائٹنر نے اپنے رسالہ Asiatic Quarterly Review (ایشیاٹک کواٹرلی ریویو) کے اکتوبر 1886ء کے شمارے میں ایک مضمون 'جہاد' میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا جن کا ذکر گذشتہ آراء میں ہو چکا ہے۔ ذیل میں ہم نے انہی خیالات کو دہرانے کی بجائے انکی دیگر قسم کی باتوں کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

''جب لوگ یہ کہتے ہیں کہ جہاد کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ غیر مسلمانوں کی حکومت یا ملک کے خلاف جنگ کریں، اور وہ اس کو جہاد کا نام دیتے ہیں، گو یہ ممکن تو ہے کہ بعض حالات میں اس لفظ کو اس رنگ میں استعمال کرنا جائز ہے، مگر انکا یہ کہنا ایک بیہودہ بات ہے، اور وہ اس مذہب کے متعلق علم رکھے بغیر اس پر ایک توہین آمیز الزام لگا رہے ہیں جسکا وہ مذہب مستحق نہیں۔''

''جب کچھ لوگوں نے محمدؐ سے اجازت چاہی کہ وہ مقدس جنگ میں شریک ہوں جو اِن لوگوں کے خلاف تھی جو مسلمانوں پر ظلم و تشدد کر رہے تھے، تو انہوںؐ نے جواب دیا: ''تمہارا حقیقی جہاد اپنے والدین کی خدمت کرنے کے لئے پوری کوشش کرنا ہے''۔ قرآن جب جہاد کا لفظ استعمال کرتا ہے تو وہ اس لفظ کے معنی کہ اپنے گناہوں کے خلاف جنگ کرنا، اس معنی کو فوقیت دیتا ہے: ''اور جو نیکی کے لئے جہاد کرتا ہے ہم اسے صحیح راستہ دکھائینگے'' (69:29)۔ ایک اور مقام پر 52:25 میں قرآن تلقین کرتا ہے کہ کافروں سے ''بڑا جہاد کر'' یعنی روحانی تلوار سے اور ان دلائل سے جو مسلمانوں کی نازل شدہ مقدس کتاب میں دیے گئے ہیں۔ احادیث میں جہاں نبیؐ کے اقوال اور سنت درج ہیں، وہاں ہے کہ ایک مرتبہ جب ایک جنگ لڑنے والا گروہ کافروں کے خلاف جنگ میں فتح حاصل کر کے، خوشی مناتا ہوا واپس اپنے گھروں کے امن و چین میں آیا جہاں وہ اطمینان سے اپنے

دین پر عمل کرتے تھے تو نبیؐ کے پاس سے گزرتے ہوئے انہوں نے کہا: ''ہم چھوٹے جہاد سے، جو دینِ اسلام کے ساتھ زیادتی کرنے والوں کے خلاف تھا، بڑے جہاد کے لئے واپس آئے ہیں، یعنی وہ جنگ جو گناہ کے خلاف کی جاتی ہے۔''

''مذہبی معاملات میں تشدد کا استعمال جائز نہیں، اگرچہ عام تاثر یہی ہے کہ اسلام کی تعلیمات کی بنیادی روح یہی ہے۔ قرآن کی دوسری سورت میں واضح طور پر ہے: ''دین میں کوئی تشدد نہیں ہونا چاہیے'' (256:2)۔ یہ آیت خاص طور پر اوائل میں اسلام قبول کرنے والوں کے لئے نازل ہوئی تھی، جن کے بیٹوں کی پرورش بت پرستی یا یہودیت میں ہوئی، اور ان کے والدین کی خواہش تھی کہ ان کو جبراً اسلام قبول کرایا جائے۔ بلکہ جب غیر مسلم بچوں کی مائیں اپنے مسلمان رشتہ داروں سے اپنے بچوں کو لینا چاہتی تھیں، تو محمدؐ نے بچوں کو اپنے پاس رکھنے کی (مسلمانوں کی) ہر کوشش کو روک دیا۔''

''اس کے برخلاف سورت حج میں یہ نہایت واضح طور پر درج ہے کہ جہاد کا مقصد مساجد، گرجاگھروں، یہودیوں کی عبادت گاہوں اور راہب خانوں کو تباہی سے محفوظ کرنا ہے (40:22)۔ ہمیں صلیبی جنگوں میں ایسے عیسائیوں کے نام نہیں ملتے جن کا مقصد مساجد اور یہودیوں کی عبادت گاہوں کی حفاظت کرنا تھا۔ مگر جب مسلمانوں کو سپین سے فرڈیننینڈ (Ferdinand) اور اسابیلا (Isabella) نے نکالا، جہاں اس قوم نے صنعت اور علوم کو لاکر فروغ دیا تھا، اور پھر وہ عیسائیوں کی مخالفت کرنے پر مجبور ہوئے، تب جہاد کا یہ نیا معنی قدرتی طور پر زور پکڑ گیا کہ جہاد سے مراد عیسائیوں سے دشمنی کرنا ہے۔ کیونکہ جہاد کا بنیادی مقصد از حد تک یہی ہے کہ دینِ اسلام کی پیروی پر حملوں کے خلاف اسکی حفاظت کے لئے کوشش کرنا، اسی لئے مسلمان جرنیلوں کو خاص طور پر یہ ہدایت دی گئی تھی کہ کسی ایسی جگہ حملہ نہ کیا جائے جہاں مسلمانوں کو اذان دینے کی آزادی ہو یا جہاں ایک بھی مسلمان بلاخوف وخطرہ اپنے دین پر چل سکتا ہو۔''

9۔ سرٹی۔ڈبلیو۔ آرنلڈ

سر تھامس واکر آرنلڈ Sir Thomas Walker Arnold (پیدائش 1864ء، وفات 1930ء) اپنی تعلیم کیمرج یونیورسٹی میں مکمل کرنے کے بعد ہندوستان میں مشہور علی گڑھ کالج میں فلاسفی کے استاد رہے اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں فلاسفی کے پروفیسر کے طور پر کام کیا جہاں علامہ محمد اقبال آپکے زیرِ تعلیم رہے۔ 1921ء سے وفات تک آپ لندن کے سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز (SOAS) میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر رہے۔ آپ عربی، فارسی اور اسلام کے تمدن کی تاریخ کے ایک ممتاز عیسائی سکالر تھے۔ آپنے ایک انتہائی علمی اور تحقیقی کتاب The Preaching of Islam لکھی جس کا دوسرا ایڈیشن آپنے 1913ء میں شائع کیا۔ یہ کتاب مسلمانوں میں اتنی مقبول ہوئی کہ اسکے تراجم مسلمانوں کی کئی زبانوں میں نکلے۔ اس کا اُردو ترجمہ "دعوت اسلام" کے نام سے مشہور ہے۔ ذیل کے اقتباسات کا ترجمہ ہم نے انگریزی کتاب، مذکورہ بالا ایڈیشن سے کیا ہے، اور صفحے نمبر اسی کے ہیں۔

کتاب کی تمہید میں آرنلڈ صاحب لکھتے ہیں:

"اسلام نے اپنے سیاسی زوال اور انحطاط کے زمانہ میں بھی چند انتہائی شاندار روحانی فتوحات حاصل کیں۔ دو عظیم تاریخی مواقع پر وحشی کافروں نے نبیؐ کے ماننے والوں کی گردنوں پر اپنے پاؤں رکھ کر ان کو پامال کیا... لیکن دونوں مرتبہ فاتحین نے بالآخر اسی قوم کا مذہب اختیار کر لیا جس کو انہوں نے مغلوب کیا تھا۔ اسی طرح کسی حکومت کی قوت کے بغیر مسلمان مبلغین نے اسلام کی تبلیغ کو وسطی افریقہ، چین اور جزائر شرق الہند تک پہنچایا۔" (صفحہ 2)

یعنی اسلام کا تلوار سے پھیلنا تو بہت دور، حقیقت یہ ہے کہ وہ کافر قومیں جنہوں نے مسلمانوں کو شکست دی اور اسلام کے مؤخر زمانہ میں ان پر مدت تک حکومت کی، بالآخر وہ

خود بھی مسلمان ہو گئے، جیسا کہ آرنلڈ صاحب نے یہاں لکھا ہے۔

اس کے بعد آرنلڈ صاحب قرآن مجید کی اول زمانہ میں مکہ میں نازل ہونے والی آیات کا حوالہ دیتے ہوئے جن میں مسلمانوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اسلام کی تبلیغ کو دلائل سے کریں، لکھتے ہیں:

''اسی قسم کے احکامات مدنی سورتوں میں بھی ملتے ہیں جو اس وقت نازل ہوئیں جب محمدؐ ایک بڑی فوج کے کمانڈر تھے اور طاقت اور اقتدار کے انتہا پر پہنچے ہوئے تھے۔'' (صفحات 3 تا 4)

یعنی آرنلڈ صاحب کی رائے میں جیسے قرآن کریم کی ابتدائی نازل شدہ آیات میں یہ تعلیم تھی کہ اسلام کی تبلیغ کو دلائل اور پر امن طریق پر کیا جائے، بعد میں نازل ہونے والی مدنی آیات میں بھی وہی تعلیم ہے۔

آرنلڈ صاحب مزید لکھتے ہیں:

''نبیؐ، اسلام کے مبلغین کی طویل فہرست کے سر پر ہیں جنہوں نے کفار کے دلوں میں اپنے مذہب کے لئے قبولیت کا دروازہ کھولا۔ مزید براں ہمیں اسلام کی تبلیغی روح کے آثار ظالم لوگوں کے ظلم و ستم یا انتہاپسندوں کے غیظ و غضب میں تلاش نہیں کرنے چاہیے، اور نہ ہی ان فرضی شخصیات کے کارناموں میں جن کے ایک ہاتھ میں بقول مخالفین تلوار اور دوسرے میں قرآن تھا، بلکہ ان خاموش، گمنام مبلغین اور تاجروں کی کوششوں میں جنہوں نے دنیا کے ہر کونے میں اسلام کے پیغام کو پہنچایا ہے۔ ایسے پر امن طریق تبلیغ اور دلائل سے لوگوں کو متوجہ کرنے کا طریق صرف اس وقت نہ اختیار کیا گیا، جیسے کہ بعض معترضین لوگوں کو باور کرانا چاہتے ہیں، جب سیاسی حالات ایسے تھے کہ طاقت اور تشدد کا استعمال ناممکن تھا یا مصلحتِ وقت کے مطابق نہیں تھا۔ بلکہ ایسا طریق اختیار کرنے کا حکم سختی سے قرآن مجید کی متعدد آیات میں موجود تھا، جو مندرجہ ذیل

ہیں۔"(صفحات 4 تا 5)

اسکے ثبوت میں مصنف قرآن مجید کی دس آیات پیش کرتا ہے جن کا نزول مکی دور میں ہوا۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے:

"ایسے احکام صرف مکی سورتوں تک ہی محدود نہیں بلکہ کثرت سے مدنی سورتوں میں بھی موجود ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں۔"(صفحہ 6)

یہاں آرنلڈ صاحب مدنی دور کی سات آیات کا حوالہ دیتے ہیں، مثال کے طور پر: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ، 2: 256) یعنی "دین میں کوئی جبر نہیں"، وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (التغابن، 12:64) یعنی "اور اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ پھر اگر تم پھر جاؤ تو ہمارے رسول پر صرف پیغام کھول کر پہنچا دینا ہے"۔ اس طرح مصنف نے اس غلط خیال کی تردید کر دی ہے کہ وہ آیات جو رسولِ اکرم صلعم کی زندگی کے بعد کے حصہ میں مدینہ میں نازل ہوئیں ان میں غیر رواداری، تشدد اور جبر کو اسلام کی اشاعت کے سلسلہ میں استعمال کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

رسولِ اکرمؐ کے مکہ فتح کرنے کے بعد کثرت سے لوگوں کا اسلام میں داخل ہونے کے بارے میں آرنلڈ صاحب لکھتے ہیں:

"ان لوگوں میں سے جو مکہ فتح ہونے کے بعد اسلام میں داخل ہوئے وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے محمدؐ کی بعثت کے اوائل میں ان پر بدترین ظلم وستم ڈھائے، اور جن کو اب آپؐ کے صبر اور عفو کے سلوک کی وجہ سے اسلام کی برادری میں جگہ ملی۔"(صفحہ 38)

"اس طرح عرب کے قبائل کو نبیؐ کی تابعداری کی ترغیب ہوئی، اور انہوں نے آپکو نہ صرف عرب کی سب سے بڑی فوجی قوت کے سربراہ کی حیثیت سے قبول کیا، بلکہ

ایک معاشری نظام کے معلّم کی حیثیت سے بھی، جس نے دوسرے ہر طرح کے سماجی نظام کو کمزور اور غیر موثر بنادیا تھا۔ محمدؐ اس بات میں کامیاب ہوگئے کہ انہوں نے اپنے دور کے لاقانونی، غیر منظم معاشرہ میں قومی اتحاد کے جذبہ کو داخل کیا، اور باہمی حقوق اور فرائض کا احساس پیدا کیا جو کہ عربوں نے پہلے کبھی نہ محسوس کیا تھا۔"(صفحات 40 تا 41)

آرنلڈ صاحب اسکے بعد اپنی کتاب لکھنے کے مقصد کے بارے میں لکھتے ہیں:

"پس ابتدا سے اسلام ایک تبلیغی مذہب کا رنگ لیے ہوئے ہے جو لوگوں کے دلوں کو فتح کرنا چاہتا ہے، ان کو حلقہ بگوش اسلام کرنا چاہتا ہے اور ان کو قائل کر کے مسلمانوں کی اخوت میں شامل ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔ اور جس طرح یہ طریق شروع میں اختیار کیا گیا تھا، یہی طریق آج کے دن تک جاری ہے، جیسا کہ اگلے صفحات کا مقصد ہے ثابت کرنا۔"(صفحہ 44)

رسولِ اکرم صلعم کے زمانہ میں اور اسکے فوری بعد عیسائی قبائل کے اسلام قبول کرنے کے متعلق آرنلڈ صاحب ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

"انکے اسلام میں داخل ہونے کا جو اصل محرّک تھا وہ جبر نہیں تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ عرب کے عیسائیوں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات تھے۔ خود محمدؐ نے کئی عیسائی قبیلوں سے معاہدے کئے اور ان سے وعدہ کیا کہ وہ ان کی حفاظت کریں گے اور یہ ضمانت دی کہ ان کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی ہوگی اور ان کے پادریوں کے پہلے سے حاصل شدہ حقوق اور اختیار بدستور قائم رہیں گے۔ اسی قسم کے دوستانہ تعلقات نے محمدؐ کو ماننے والوں اور انکے ہم وطنوں، جو اپنے پرانے مذہبی عقائد پر قائم تھے، میں اتحاد پیدا کیا۔ اور ان میں بہت سے لوگ اپنی رضامندی سے مسلمانوں کو ان کی فوجی مہموں میں مدد دینے کے لئے آگے بڑھے۔"(صفحات 47 تا 48)

"جو مثالیں اوپر دی جاچکی ہیں کہ کس طرح پہلی صدی ہجری کے مسلمان فاتحین نے عیسائی عربوں کے ساتھ رواداری کا سلوک کیا اور پھر ان کی بعد کی نسلوں نے اس کو قائم رکھا، ان سے ہم اس نتیجہ پر پہنچنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ عیسائی قبیلے جنہوں نے اسلام قبول کیا انہوں نے ایسا خود اپنی پسند اور مرضی سے کیا"۔(صفحات 51 تا 52)

اپنی کتاب کے آخر میں آرنلڈ صاحب لکھتے ہیں:

"ہم گذشتہ صفحات میں یہ ثابت کر چکے ہیں کہ اسلام اعتقادی طور پر مذہبی رواداری اور آزادی کی تلقین کرتا ہے غیر مذاہب کے ان تمام لوگوں کے لئے جو اپنی حفاظت کے معاوضے میں جزیہ ادا کریں۔ اگرچہ تاریخ اسلام کے صفحات ظلم و ستم کے بعض ہنگاموں سے بھی خون آلودہ ہیں، باوجود اس کے، عمومی طور پر کفار کو مسلمانوں کی حکومت میں ایسی رواداری حاصل رہی جو یورپ میں جدید زمانہ سے پہلے ہمیں نظر نہیں آتی۔ جبر سے لوگوں کو مسلمان کرنے کی ممانعت تھی، جیسا کہ قرآن کی تعلیم ہے۔... جہاں مسلمانوں کی حکومت صدیوں تک رہی وہاں عیسائیوں کے متعدد فرقوں اور جماعتوں کا اب تک وجود باقی رہنا اس بات کا مستقل ثبوت ہے کہ ان کو مذہبی رواداری کا فائدہ حاصل تھا۔ اور اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ متعصب اور انتہا پسند مسلمانوں کی طرف سے جو ظلم و ستم وقتاً فوقتاً عیسائیوں کو اٹھانے پڑے وہ خاص خاص مقامی حالات کی وجہ سے ہوئے تھے، نہ اس لئے کہ عدم رواداری کا کوئی تسلیم شدہ اصول تھا جو اس کا محرّک تھا۔... لیکن ایسے ظلم و ستم کا اسلامی شریعت کے مذہبی یا سماجی قانون میں قطعاً کوئی جواز یا سند نہیں۔ قرآن مجید میں وہ آیات جو جبر کے ساتھ اسلام کو پھیلانے کی ممانعت کرتی ہیں اور تبلیغ کو ہی دین پھیلانے کا واحد جائز ذریعہ قرار دے کر اس کی تلقین کرتی ہیں، ان کے حوالے پہلے دیے جاچکے ہیں... اور انہی عقائد کی مسلمان فقہاء نے اپنے فتووں میں تصدیق کی ہے۔"(صفحات 420 تا 421)

"اسلام کے طاقت ور حکمرانوں میں سے کسی کے لئے بھی یہ آسان تھا کہ وہ عیسائی رعایا کو بالکل ختم کر دیتے یا اپنی سرزمین سے نکال دیتے جیسے سپین کے عیسائیوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا، یا انگریزوں نے تقریبا چار صدیوں تک یہودیوں سے کیا... مفتیوں نے جو مسلمان حکمرانوں کو اس قسم کے ظالمانہ قصد سے باز رکھا تو انہوں نے یہ بحیثیت اسلامی شریعت اور اسلامی رواداری کے معلّم اور ترجمان کیا۔" (صفحات 422 تا 423)

11- مسلمانوں میں عدم برداشت کیسے پیدا ہوئی؟

ایک سوال غور کے قابل ہے کہ یہ کس طرح اور کیونکر ہوا کہ تنگ نظری اور تعصّب کے عقاید اور رویے مسلمانوں میں پھیل گئے ہیں حالانکہ وہ قرآن مجید اور سنتِ رسولؐ کے سراسر خلاف ہیں۔ مثال کے طور پر یہ تصوّر کہ جو شخص رسول اکرم صلعم کی توہین کرے، ان کے خلاف نازیبا الفاظ کہے، اس کو موت کی سزا دی جائے۔ یا یہ کہ جو شخص اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کرے اس کو بھی موت کی سزا دی جائے۔ اور پھر یہ کہ جو غیر مسلم مسلمان سلطنت میں رہ رہے ہوں ان کو مذہبی آزادی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ اسلام کی اصل تعلیم سے انحراف کیسے ہوا، اس کے بارے میں حضرت مولانا محمد علیؒ صاحب، مترجم و مُفسّر قرآن انگریزی و اُردو، نے آج سے عرصہ دراز پہلے 1929ء میں اپنے ایک خطبہ جمعہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، جو کہ آپنے جماعتِ احمدیہ لاہور کی مرکزی مسجد بمقام احمدیہ بلڈنگز لاہور میں دیا۔ اس کی ابتدا میں آپ فرماتے ہیں:

"ایک شخص نے ایک کتاب لکھی ہے جو توسیعِ اسلام کے موضوع پر ہے۔ اس کے آخر میں اس نے پانچ چھ امور ایسے لکھے ہیں جن کا منشاء ہے کہ رسول اللہؐ کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ایسا خیال پیدا کر دیا جائے کہ آپؐ نعوذ باللہ ایک سخت اور ظالم انسان تھے، کہ جہاں کسی نے آپؐ کے متعلق کوئی ناپاک لفظ کہے، یا کوئی گستاخی وغیرہ کی، فوراً اسے تہہ تیغ کر دیا۔ اس قسم کے بعض واقعات اس نے لکھے ہیں جن کے لئے سیرت کی کتابوں سے حوالے دیے ہیں۔"

جس کتاب کا مولانا محمد علی صاحب یہاں ذکر کر رہے ہیں وہ ایک مغربی مصنف ڈبلیو ولسن کیش (W. Wilson Cash) نے 1928ء میں بعنوان The Expansion of Islam، یعنی "اسلام کا پھیلنا" شائع کی تھی۔ حضرت مولانا نے اس کا جواب انہی دنوں

انگریزی کے ایک کتابچہ میں دیا، جسکو اسکے بعد اپنی انگریزی کتاب ''محمد دی پرافٹ'' کے ایڈیشن دوم میں ایک باب کے طور پر شامل کر دیا۔

اب ہم ذیل میں حضرت مولانا محمد علیؒ صاحب کے اس خطبہ سے طویل اقتباسات دیتے ہیں جنکا تعلق ہمارے موضوع سے ہے:

''سیرت اور حدیث کی کتب میں فرق: اصل بات یہ ہے کہ سیرت کی کتابوں میں روایات ہر قسم کی اکٹھی کر دی گئی ہیں اور زیادہ تحقیق سے کام نہیں لیا گیا۔ جو کچھ روایات کے اندر کسی کو ملا، وہ اس نے سیرت میں لکھ دیا۔ حدیث کی کتابوں میں اور سیرت کی کتابوں میں یہی بڑا فرق ہے کہ حدیث کو محدثین نے بڑی احتیاط سے لیا۔ بایں بعض ایسی باتیں احادیث میں آگئی ہیں جو قرآن کریم کے خلاف ہیں۔ اور سیرت کی کتابوں میں تو روایات کے جمع کرنے میں کوئی احتیاط ملحوظ نہیں رکھی گئی۔ اس لئے وہاں ایسی باتوں کا آجانا کوئی بعید بات نہیں۔ اور چونکہ رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے کہ جو بات قرآن کریم کے خلاف دیکھو، اسے چھوڑ دو، اس لئے لازماً ایسی باتوں کے متعلق بڑی احتیاط کرنی چاہیے۔

قرآن کریم اور روایات: میں نے اس ذیل میں جتنا غور کیا ہے، میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان امور کو آپؐ کی ذات سے ایک ادنیٰ مناسبت بھی نہیں۔ قرآنِ کریم پر جب ہم غور کرتے ہیں تو وہاں سے صاف پتہ لگ جاتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کی ذات ان باتوں سے بہت بالا ہے۔ اصل میں قرآن کریم ہی ایک چیز ہے جو سیدھے مسلک پر ہمیں قائم رکھتی ہے۔ روایات میں راوی کا اپنا خیال بھی بہت کچھ دخل پا گیا ہے۔ واقعات سے اپنے خیال کے مطابق جو کچھ کسی نے سمجھا، اس کو اپنے رنگ میں بیان کر دیا۔ بالخصوص غزوات کے جو اسباب ہیں، ان کو سمجھنے میں بہت ٹھوکر کھائی ہے۔ روایات کو جمع کرنے کا کام ایسے زمانہ میں ہوا جب اسلام کی بادشاہت تھی۔ اس وقت مسلمانوں کی ذہنیت ایسی

ہوگئی تھی جیسے کہ حکمران قوم کی ذہنیت بن جاتی ہے، کہ دوسری اقوام پر زیادتی کر لینا کوئی بُری بات نہیں۔ اسی ذہنیت کے ماتحت روایات میں بعض ایسی روایات داخل ہوگئی ہیں۔

قرآن کا مسلک: ان کی اصلاح قرآن کریم سے ہوتی ہے۔ فرماتا ہے: لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ("رَاعِنَا نہ کہو، اور کہو اُنْظُرْنَا"، البقرہ، 2 :104)۔ ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ خود قرآن نے دوسری جگہ فرمایا ہے: وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا وَ اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّ رَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَ طَعْنًا فِي الدِّيْنِ ؕ (النساء، 4: 46)، "اور کہتے ہیں ہم نے سن لیا اور ہم نہیں مانتے۔ اور سن، تُو نہ سنوایا جائے۔ اور (کہتے ہیں) رَاعِنَا اپنی زبانیں مروڑتے ہوئے اور دین پر طعن کرتے ہوئے"۔ یعنی یہودی لوگ رَاعِنَا زبانوں کو مروڑ کر کہتے تھے، یعنی بجائے رَاعِنَا کے، جس کے معنی ہیں ہماری رعائت کیجئے، رَعِنَ کہہ دیتے تھے، جس کے معنی ہیں بیوقوف، احمق۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلعم کے منہ پر یہ لفظ لوگ کہتے تھے۔ بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ کے بجائے اَلسَّامُ عَلَيْكُم کہہ دیتے تھے (یعنی "تم پر سلامتی" کی بجائے "تم پر موت" ہو)۔ ان کا قول نقل کیا ہے: اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ (آلِ عمران، 3:181) یعنی "اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں"۔ ان کے استہزاء اور گالیوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ اور بھی طرح طرح کے لفظ آپؐ کے متعلق استعمال کرتے تھے، جن کو قرآن کریم نے طَعْنًا فِي الدِّيْنِ ("دین پر طعن") قرار دیا ہے۔ لیکن رسول اللہ صلعم نے ان الفاظ کے کہنے والوں کو کبھی کوئی سزا نہیں دی۔

قرآن کریم میں یہ بھی آتا ہے: وَ لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ

قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا (''اُن سے جنہیں تمہارے سے پہلے کتاب دی گئی اور اُن سے جو مشرک ہوئے، تم بہت سی دُکھ دینے والی باتیں سنو گے''، آلِ عمران، 186:3)۔ اس میں صفائی کے ساتھ بتادیا ہے کہ تم کو بہت سی گالیاں بھی سننی پڑیں گی۔ اور اس پر کیا کرنے کا حکم دیا: وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ، ''اگر صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ عزم الامور (بڑی ہمت کے کاموں) میں سے ہے'' (186:3)۔ یہاں صبر کے ساتھ تقویٰ کا حکم دیا ہے۔ تقویٰ سے کیا مراد ہے؟ اس میں بتایا ہے کہ نہ صرف یہ کہ تم برداشت سے کام لو، اور کسی کو گالی نہ دو، بلکہ جواب میں حسنِ اخلاق کا ثبوت دو، تو یہ عزم الامور کی بات ہے۔

شاتم رسول کے متعلق آنحضرت صلعم کا طرزِ عمل: آپ کو علم ہے کہ مسلمانوں میں عام طور پر یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ رسول اللہ صلعم کو جو شخص گالی دے، اس کا سر کاٹ دینا چاہیے۔ میں نے اس کے متعلق تحقیق کی ہے۔ مجھے یہ قرآن کے خلاف نظر آتا ہے۔ قرآن کریم نے صاف طور پر گالی اور ایذاء پہنچنے پر صبر اور تقویٰ کا حکم دیا ہے۔ اور رسول اللہ صلعم کی زندگی میں ایسے واقعات ملتے ہیں کہ آپؐ نے ایسے مواقع پر کبھی اس قسم کا طریق اختیار نہیں کیا، جو آپؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ خود عبد اللہ بن اُبیّ کا واقعہ ہے کہ اس نے کسی سفر میں مسلمانوں سے کہا کہ ''اچھا! مدینہ چل کر دیکھیں، کس طرح عزت والے لوگ ذلیل لوگوں کو وہاں سے نکالتے ہیں؟'' باوجود اس کے رسول اللہ صلعم نے اس کو کوئی سزا نہیں دی![1]

[1] نوٹ از مصنف کتاب ہذا: عزت والوں سے اسکی مراد منافقین تھے جنکا وہ سردار تھا، اور ذلیل لوگوں سے اسکی مراد مسلمان اور رسول اللہؐ تھے۔ یہ واقعہ ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، تحت سورۃ المنافقین، میں پایا جاتا ہے۔ عبد اللہ بن اُبیّ کے یہ الفاظ قرآن مجید، سورۃ المنافقین (8:63) میں دیئے گئے ہیں۔

شاتم رسول کو قتل کرنے کا مضر اثر: بظاہر یہ بات دل کو بڑی خوش کرنے والی معلوم ہوتی ہے کہ ہم رسول اللہ صلعم کے متعلق ایسی غیرت رکھتے ہیں کہ جو شخص آپؐ کو گالی دے اس کا سر اُڑادیں! لیکن میرا خیال ہے کہ بہت سی ایسی باتوں میں، جو دلوں کے اندر جمی ہوئی ہیں، ان کے لئے قرآن کو از سرِ نو پڑھنے کی ضرورت ہے۔ بعض موقعوں پر تفسیروں کو چھوڑ کر بھی قرآن کریم کو پڑھنے کی ضرورت ہے۔ یہ غور کرنے کے قابل بات ہے کہ اس خیال کا اثر دوسروں پر کیا پڑے گا؟ ایک پہلو تو وہ تھا کہ ایسی غیرت دکھائی جائے کہ گالی دینے والے کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن دوسرا پہلو اس کا یہ بھی ہے کہ اس سے دوسرے، بجائے اسلام سے محبت کرنے کے، اس سے نفرت کرنے لگیں گے اور اسے وحشیانہ مذہب سمجھیں گے! غور کا مقام ہے کہ اگر ایک بڑے آدمی پر کوئی شخص اعتراض کرے یا اس کی شان میں کوئی گستاخی کرے، تو کیا ہمیں اس سے یہ توقع کرنی چاہیے کہ وہ بالمقابل نرمی دکھا کر اپنے اخلاق حمیدہ کا ثبوت دے۔ یا یہ کہ ڈنڈا لے کر ایسے معترض کو مارنے کے لئے تیار ہو جائے! یہی فی الحقیقت قرآن کی تعلیم ہے کہ مخالف کے ہاتھ سے دُکھ پہنچنے پر صبر و برداشت سے کام لینا چاہیے۔ اسلام یہ نہیں سکھاتا ہے کہ جہاں کسی نے گالی دی، فوراً اس کا سر کاٹ دیا جائے!

گالی کا جواب: مسلمانوں میں سے جو بات اس وقت نکل گئی ہے، وہ برداشت کا مادہ ہے۔ یہ جو چھوٹی چھوٹی باتوں میں جھگڑا پیدا ہوتا رہتا ہے، یہ اس وجہ سے ہے کہ برداشت کا مادہ ان میں نہیں رہا۔ حالانکہ مسلمان کی شان یہی ہے کہ اختلاف رائے کو برداشت کرے۔ تکلیف اور دُکھ کو برداشت کرے۔ یہ خوبی کی بات ہے۔ بڑائی اس میں نہیں کہ جہاں کسی نے گالی دی، فوراً جواب میں اسے بھی گالی دے دی۔ بلکہ بڑائی اس بات میں ہے کہ صبر سے کام لیا جائے۔ اس لئے تم اختلاف رائے کو برداشت کرو۔ گالیاں ملنے اور دُکھ پہنچنے پر صبر کرو۔ اس میں تمہاری بڑائی ہے۔ کسی نے اگر کسی کے خلاف دو لفظ کہہ

دیے اور وہ غصہ میں آکر ویسا ہی کہنے لگا، تو اس سے وہ بڑا نہیں بن جاتا۔

قرآن کریم میں رسول اللہ صلعم کی شان میں ہے: وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (آلِ عمران، 3: 159)، "اگر تم سخت کلام، سخت دل ہوتے تو لوگ تمہارے ارد گرد سے منتشر ہو جاتے"۔ یہ اصول بتایا ہے جماعت بنانے کا اور جماعت کو قائم رکھنے کا، کہ انسان خود سخت گو نہ ہو، بلکہ ایسا نرم دل ہو کہ دوسرے کی سخت گوئی کو برداشت کرے اور اسے معاف کرنے کے لئے تیار ہو! قرآن کریم اس تعلیم سے بھرا پڑا ہے۔ کہیں فرمایا: وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ("میرے بندوں کو کہہ، کہ وہ بات کہیں جو اچھی ہو"، بنی اسرائیل، 17: 53)۔ پھر فرمایا: اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ (حٰمٓ سجدۃ، 41: 34) یعنی نہایت عمدگی کے ساتھ بدی کی مدافعت کرو، اگر تم اس طریق کو اختیار کروگے اور نرمی کے ساتھ پیش آؤ گے تو اگر تمہارے اور اس کے درمیان عداوت ہے تو تمہارے حسنِ سلوک سے وہ ایسا ہو جائے گا کہ گویا تمہارا گہرا دوست ہے۔

قرآن کس طرف لے جاتا ہے: اب اس ساری تعلیم کو مدِ نظر رکھیئے، اور دیکھئے کہ قرآن کریم کس طرف لے جاتا ہے؟ قرآن شریف اس بات کی تعلیم ہمیں دیتا ہے کہ اپنے شدید سے شدید دشمن کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کا برتاؤ کریں اور اس کی برائی کو صبر کے ساتھ برداشت کریں۔ بے شک انسان کو دوسرے کی سخت بات سے غصہ آتا ہے۔ اور وہ یہی خیال کرتا ہے کہ یہ تو دشمن ہے۔ اس کو خوب ذلیل کرنا چاہیے۔ لیکن قرآن کریم انسان کو بلند اخلاق پر قائم کرنا چاہتا ہے۔"

(خطبہ مورخہ 22 مارچ 1929ء، مندرجہ 'خطبات محمد علی'، جلد 7، صفحات 159 تا 163)

اس خطبہ کے اقتباسات کے بعد ہم ذیل میں حضرت مولانا محمد علی صاحب کے ایک اور خطبہ سے، جو انہوں نے ماہ رمضان میں مورخہ 5 نومبر 1937 کو ارشاد فرمایا، چند اقتباسات پیش کرتے ہیں:

"قرآن کریم کے اندر ایسے ایسے زبردست اور اعلیٰ اصول رکھے گئے ہیں۔ اور ایسے زمانے میں رکھے گئے ہیں، جن کو دیکھ کر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ واقعی خدا عالم الغیب کا کلام ہے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ، 2: 256)، یعنی دین میں کوئی جبر نہیں۔ کتنا اعلیٰ اصول ہے۔ تاریخ عالم کو دیکھو تو نظر آئے گا۔ کہ دین کے بارہ میں بے انتہاء جبر ہوا ہے۔ لاکھوں ہزاروں انسان مذہب کے لئے قتل کئے گئے۔ انہیں طرح طرح کی ایذائیں دی گئیں۔ انہیں اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا۔ لیکن عرب کا ایک اُمّی اُٹھتا ہے۔ اور یہ اصول باندھتا ہے کہ دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں ہونا چاہیے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ، یہ چار لفظ کس قدر حکمت پر مبنی ہیں!

مذہب اور جبر دو متضاد چیزیں ہیں: دراصل مذہب اور جبر ہیں ہی دو متضاد چیزیں۔ اور بالکل ایک دوسرے کی ضد۔ جبر مادی طاقت ہے اور دین روحانی طاقت۔ جبر جسمانی یا مادی قوت کا نتیجہ ہے۔ کسی کو اپنی جسمانی اور مادی طاقت سے کسی چیز کے ماننے پر مجبور کرنا۔ اور مذہب ہے روحانی طاقت کا سرچشمہ جس سے روحانی طاقت پیدا ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنے پھیلنے کے لئے مادی طاقت کا محتاج ہو، تو پھر وہ روحانی طاقت کا سرچشمہ اور خدا کی طرف سے نہیں کہلا سکتا۔

سچا مذہب مادی طاقت کا محتاج نہیں: خوب یاد رکھو۔ کہ سچا مذہب مادی طاقت کا محتاج نہیں۔ وہ اپنی روحانی طاقت سے پھیلتا ہے۔ . . . واقعات کو دیکھ لیجیے۔ ایک برگزیدہ انسان محمد رسول اللہ صلعم عرب میں اُٹھتے ہیں۔ کوئی مادی طاقت پاس نہیں۔ وہ لوگوں کو خدا کی طرف بلاتے ہیں۔ ابتداء میں جو لوگ آپؐ کے ساتھ ہوئے، انہوں نے طرح

طرح کے دکھ اور مصیبتیں اُٹھائیں۔ قتل ہوئے۔ وطن اور مال و دولت کو چھوڑا۔ رشتہ داروں کو چھوڑا۔ لیکن محمد رسول اللہ صلعم کو نہ چھوڑا۔ آخر کوئی قوت ہی تھی، جس کی وجہ سے ایسا ہوا۔

اسلام کے متعلق ایک صریح غلط خیال: یہ خیال کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا بالکل غلط اور واقعات کے خلاف ہے۔... اسلام کے متعلق بعض ناواقف غیر لوگ کہتے ہیں کہ اس میں رواداری نہیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ اگر اسلام غیر روادار مذہب ہوتا، تو اس میں لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کی اعلیٰ تعلیم ہر گز نہ ہوتی۔

اسلام انتہائی رواداری کا مذہب ہے: اسلام کی تعلیم اور طرز عمل تو اس قدر اعلیٰ اور وسیع ہے کہ اس کے اظہار کے لئے رواداری کا لفظ کافی نہیں۔ بلکہ اس سے بہت کچھ زیادہ کہنا چاہیے۔ اسلام نے صرف یہی نہیں کیا کہ دوسرے مذاہب زندہ رہیں، بلکہ یہ کہا کہ دوسرے مذاہب بھی خدا کی طرف سے ہیں۔ ان کی کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لانے کو ضروری قرار دیا۔ ان کا انکار نہیں کرایا بلکہ ان کو منوایا۔ کیونکہ اسلام کے اندر اس قدر زبردست روحانی طاقت ہے کہ اس کو کسی دوسرے مذہب کے اپنے اوپر غالب آجانے کا کوئی خطرہ نہیں...

اسلام نے دین کے بارہ میں کبھی مادی طاقت سے کام نہیں لیا: اسلام نے دین کے بارہ میں کبھی مادی طاقت سے کام نہیں لیا۔ مسلمانوں نے بے شک تلوار بھی اُٹھائی۔ عرب بھی فتح ہو گیا۔ مکہ بھی فتح ہو گیا۔ اور تلوار کے زور سے فتح ہوا۔ لیکن دین کے بارہ میں مطلق کوئی جبر نہیں ہوا۔ اسی مکہ میں، جہاں مسلمانوں کو انتہائی تکالیف دی گئی تھیں۔ اور ان پر طرح طرح سے ظلم اور جبر کیا گیا تھا۔ ان کو وہاں سے نکالا گیا تھا۔ اور کوئی قوم ہوتی تو خدا جانے ان مفتوحین سے کیا سلوک کرتی اور کن کن طریقوں سے انتقام لیتی اور اپنا دین منواتی۔ لیکن حضرت نبی کریم صلعم نے ان سے ایسا اعلیٰ سلوک کیا، جس کی نظیر

تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ . . .

خلفاء راشدینؓ روحانی طاقت سے حکومت کرتے تھے: اگر آپ غور کریں تو معلوم ہو گا کہ اسلام کے ابتدائی بادشاہ یعنی خلفاء راشدینؓ جو دنیوی لحاظ سے بھی بادشاہ بلکہ شہنشاہ تھے۔ کیونکہ ان کے زیر حکومت وسیع سلطنتیں تھیں۔ اور وہ زبردست فوج اور طاقت رکھتے تھے۔ لیکن وہ بھی اپنی جسمانی طاقت سے نہیں بلکہ روحانی طاقت سے حکومت کرتے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ یہ چاروں زبردست روحانی طاقت کے مالک تھے۔ اور اسی طاقت کے ذریعہ حکومت کرتے تھے۔ . . .

خلفاء راشدینؓ کے بعد افسوس ناک انقلاب: افسوس، یہ روحانی نظارہ جو پہلی چار خلافتوں میں نظر آتا ہے، بعد میں باقی نہ رہا۔ رنگ ہی پلٹ گیا۔ پھر خلافت راشدہ نہ رہی، بادشاہت آگئی۔ بادشاہت کے ساتھ جسمانی طاقت کے وہ مظاہرے بھی آئے۔ جو کہ ضروری تھا کہ آئیں۔ اس کی وجہ سے اسلام کی روحانی طاقت اس کی مادی طاقت سے دب گئی۔ اوجھل ہو گئی۔ اس پر ایک پردہ پڑنا شروع ہو گیا۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے فقہاء جن کی فقاہت بے مثل ہے۔ اور جنہوں نے اسلام کی بڑی بڑی علمی خدمات انجام دی ہیں، اسی غلطی میں مبتلا ہو گئے۔ کہ اسلام جسمانی طاقت کا محتاج ہے۔ جہاد کا مفہوم ہی بدل گیا۔ حتیٰ کہ یہاں تک کہا گیا کہ مسلمانوں اور اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ غیر مسلموں کے خلاف ہمیشہ جنگ جاری رکھیں۔ میں نے ان بحثوں کو پڑھا ہے۔ ان میں ان فقہاء کو بڑی مصیبت پیش آئی ہے۔ ایک طرف ان کا یہ غلط استدلال ہے۔ دوسری طرف اسلام کی صریح اور واضح تعلیم لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ہے۔ اور حضرت نبی کریم صلعم اور صحابہ کرامؓ کا کھلا کھلا عمل ہے۔

جہاد کا غلط مفہوم: غرضیکہ بڑے بڑے لوگ اس افسوسناک غلطی میں مبتلا ہو گئے کہ اسلام تلوار کا محتاج ہے۔ اس سے جہاد کا مفہوم بالکل بدل گیا۔ اور صرف جنگ ہی کو

جہاد سمجھا جانے لگا۔ اس غلط خیال نے ہمارے زمانے میں تو ایسی افسوس ناک صورت اختیار کرلی ہے کہ کوئی ایک غیر مسلم کو قتل کر آئے تو وہ غازی کہلاتا ہے۔ یعنی وہ ایک خلاف اسلام فعل کرکے لوگوں کے خیال میں روحانی طاقت کا مالک بن جاتا ہے۔ اس غلط خیال نے یہاں تک ترقی کی ہے کہ وہ لوگ بھی جو اس زمانہ میں اسلام کے نمائندے کہلاتے ہیں، اس سے آزاد نہیں۔ . . . جہاد کے اس غلط اور خلاف قرآن مفہوم کا اس کے سوا اور کیا نتیجہ ہو سکتا ہے کہ اسلام بدنام ہو۔ اس سے اور کوئی فائدہ تو نظر نہیں آتا۔ یوں اسلام کی روحانی طاقت اس کی مادی طاقت کے نیچے دب گئی۔"

(خطبہ مندرجہ 'پیغام صلح'، 8 نومبر 1937، صفحات 3 تا 4)

اس کتاب کا مقصد

یہ کتاب قرآنِ کریم، حدیث اور محمد رسول اللہ صلعم کی سیرت سے ثابت کرتی ہے کہ:

- اسلام، تشدد، جبر اور جنگ نہیں، بلکہ رواداری، نرمی، ہم آہنگی، اور امن کی تعلیم دیتا ہے۔
- اسلام ہر انسان کو، مسلمان ہو یا غیر مسلم، آزادی دیتا ہے کہ اپنی مرضی سے جو بھی دین، مذہب، عقیدہ، یا موقف چاہے اسے اختیار کرے۔
- اسلام میں مرتد کی کوئی قانونی سزا نہیں، توہینِ رسالت کی سزا موت نہیں۔
- ایک مسلمان کا فرض صرف تبلیغ حق ہے، بذریعہ تقریر، تحریر اور ذاتی نمونہ۔
- اسلام کے خلاف بدزبانی کا جواب الفاظ سے دیں یا اسے نظر انداز کریں۔
- جہاد کا بنیادی اور مستقل مطلب اپنے نفس کی اصلاح اور تبلیغ حق کرنا ہے۔
- اس دنیا کے باقی لوگ مسلمانوں کے ہمسائے اور زندگی کے سفر میں مسلمانوں کے ہم مسافر ہیں۔ مسلمانوں کو ان کے ساتھ امن میں رہنا چاہیے اور ان سے بھلائی کا سلوک کرنا چاہیے۔

ISBN: 978-1-906109-29-5